ربیع الثانی ۱۴۴۰ھ
دسمبر ۲۰۱۸ء

ماہنامہ میثاق لاہور

یکے از مطبوعات
تنظیمِ اسلامی
بانی: ڈاکٹر اسرار احمدؒ

- ملکی اور عالمی حالات
- قرآنِ حکیم میں ذِکرِ رسول ﷺ
- مسلمان: دہشت گرد یا مجاہد؟

داعی رجوع الی القرآن بانی تنظیم اسلامی
محترم ڈاکٹر اسرار احمد رحمہ اللہ
کے شہرۂ آفاق دورۂ ترجمہ قرآن پر مشتمل

بیانُ القرآن
ترجمہ و مختصر تفسیر

خاص ایڈیشن
- دیدہ زیب ٹائٹل
- امپورٹڈ آفسٹ پیپر
- بڑے سائز میں
- عمدہ طباعت
- مضبوط جلد

سات جلدوں پر مشتمل
مکمل سیٹ کی قیمت: 4000 روپے

عوامی ایڈیشن
- کتابی سائز
- پیپر بیک بائنڈنگ
- امپورٹڈ بک پیپر
- عمدہ طباعت
- دیدہ زیب ٹائٹل

چھ جلدوں پر مشتمل
مکمل سیٹ کی قیمت: 2200 روپے

مکتبہ خُدّام القرآن لاہور
36-K، ماڈل ٹاؤن لاہور، فون 3-35869501(042)

وَاذۡكُرُوۡا نِعۡمَةَ اللّٰهِ عَلَيۡكُمۡ وَمِيۡثَاقَهُ الَّذِىۡ وَاثَقَكُمۡ بِهٖۤ ۙ اِذۡ قُلۡتُمۡ سَمِعۡنَا وَاَطَعۡنَا ۚ (المائدۃ:۷)

ترجمہ: اور اپنے اوپر اللہ کے فضل اور اس کے میثاق کو یاد رکھو جو اس نے تم سے لیا جبکہ تم نے اقرار کیا کہ ہم نے مانا اور اطاعت کی!

ماہنامہ میثاق لاہور

اجرائے ثانی

ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ

جلد :	67
شمارہ :	12
ربیع الثانی	1440ھ
دسمبر	2018ء
فی شمارہ	30/-

مُدیر
حافظ عاکف سعید

نائب مُدیر
حافظ خالد محمود خضر

سالانہ زرِتعاون

اندرون ملک	300 روپے
بھارت و بنگلہ دیش	900 روپے
ایشیا، یورپ، افریقہ وغیرہ	1200 روپے
امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا وغیرہ	1500 روپے

ترسیلِ زر: مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

مکتبہ خدام القرآن لاہور

مقام اشاعت: 36۔کے ماڈل ٹاؤن، لاہور 54700، فون: 3-35869501
فیکس: 35834000، ای میل: maktaba@tanzeem.org
ای میل برائے ادارتی امور: publications@tanzeem.org
ویب سائٹ ایڈریس: www.tanzeem.org

مرکزی دفتر تنظیم اسلامی: "دارُالاسلام" ملتان روڈ چوہنگ لاہور
(پوسٹل کوڈ 53800) فون: 79-35473375 (042)

پبلشر: ناظم مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور
طابع: رشید احمد چوہدری مطبع: مکتبہ جدید پریس (پرائیویٹ) لمیٹڈ

مشمولات

عرضِ احوال — 5
ملکی اور عالمی حالات — ایوب بیگ مرزا

بیانُ القرآن — 11
سورۃ الصّٰفّٰت (آیات ۷۵ تا ۱۸۲) — ڈاکٹر اسرار احمدؒ

ذکرِ حبیب ﷺ — 37
قرآن حکیم میں ذکرِ رسول ﷺ — ڈاکٹر محمد نجیب قاسمی سنبھلی

حاصلِ مطالعہ — 45
مسلمان: دہشت گرد یا مجاہد؟ — پروفیسر عبداللہ شاہین

انوارِ ہدایت — 55
ماں کی عظمت — پروفیسر محمد یونس جنجوعہ

آزادئ نسواں — 60
تصورِ اقبال میں عورت: چراغِ خانہ یا شمعِ محفل؟ — پروفیسر عبدالعظیم جانباز

فقہ و اصولِ فقہ — 65
اصلی اور فرعی مسائل میں
مخالفین کے ساتھ برتاؤ کے فقہی ضابطے (۳) — ڈاکٹر احمد بن سعد الغامدیؒ

افکار و آراء — 79
حِمار بطور ایک تہذیبی علامت — محمد عمران خان

یادِ رفتگاں — 87
حاجی عبدالواحد صاحبؒ کی یادداشتیں (۱۷) — پروفیسر حافظ قاسم رضوان

بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم

ملکی اور عالمی حالات

عالمی حالات کے حوالے سے سب سے پہلے اس خطرے کا ذکر کرنا مناسب ہوگا جو تمام اُمّتِ مُسلمہ کو فوری طور پر اور انتہائی خطرناک انداز میں لاحق ہے‘ یعنی اسرائیل اور یہودی قوم۔ اسرائیل کا آغاز سے ہی ایک ایجنڈا ہے کہ وہ اپنی سرحدوں کو بڑھا کر ’’گریٹر اسرائیل‘‘ کو معرضِ وجود میں لانا چاہتا ہے۔ حیرت اور افسوس کی بات یہ ہے کہ اِس وقت تمام دنیا بلا استثناء اُس کے اِس ایجنڈے کی تکمیل کے حوالے سے اُس کی مدد کر رہی ہے۔ امریکہ‘ یورپ اور بھارت اور دوسرے بہت سے ممالک یہ مدد شعوری طور پر اور بلا واسطہ کر رہے ہیں‘ جبکہ باقی دنیا جس میں تمام مسلمان ممالک بھی شامل ہیں‘ غیر شعوری طور پر اور بالواسطہ اسرائیل کے ایجنڈے کی تکمیل میں مدد کر رہے ہیں۔ روس اور چین جیسی قوتیں گریٹر اسرائیل کے قیام کو اپنے لیے کوئی بڑا خطرہ نہیں گردانتیں‘ لہٰذا وہ مخالفت نہیں کرتیں۔

آپ شاید یہ بات تسلیم نہیں کریں گے‘ لیکن یہ ایک حقیقت ہے۔ وہ یوں کہ امریکہ یورپ وغیرہ بالادست قوتیں ہیں اور وہ اپنے زیراثر‘ زیرکنٹرول ممالک سے غیر اعلانیہ طور پر ایسے افعال سرزد کرواتی ہیں جن سے گریٹر اسرائیل کی راہ ہموار ہو۔ انہوں نے مسلم عرب کے بے حس حکمرانوں کو اچھی طرح سمجھا دیا ہے کہ گریٹر اسرائیل کے راستے میں آؤ گے تو ملیامیٹ کر دیے جاؤ گے‘ اپنی حکمرانی بچانا چاہتے ہو تو اپنی نکیل ہمارے ہاتھ میں تھما دو۔ اور عرب حکمران اِس پر مطمئن ہیں کہ اُن کا آج کا دن خیریت اور عافیت سے گزر جائے‘ کل جو ہوگا دیکھا جائے گا۔ عرب چاہتے ہیں ہم اپنے اطوار نہ بدلیں‘ اللہ اپنی سنت تبدیل کر لے۔ جب کہ اللہ ربّ العزت قرآنِ حکیم میں اپنا فیصلہ سنا چکا ہے کہ: ﴿فَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا ۚ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰهِ تَحْوِيْلًا ﴿۴۳﴾﴾ (فاطر) ’’سو تم اللہ کی عادت میں ہرگز تبدّل نہ پاؤ گے‘ اور اللہ کے طریقے میں کبھی تغیّر نہ دیکھو گے‘‘۔ اللہ اپنی سنّت تبدیل نہیں کرتا۔ عرب اللہ کو راضی کرنے کی

بجائے مغرب اور اسرائیل کو راضی کر کے اپنا تحفظ چاہتے ہیں۔ مصر ایک عرصہ ہوا اسرائیل سے سفارتی تعلقات قائم کر چکا ہے اور اس کی خوشنودی کے لیے فلسطینیوں کا حقہ پانی بند کر رہا ہے۔ ابوظہبی نے اسرائیل کے وزیرتوانائی کے ہاتھوں اپنی ایک مسجد کے توسیعی منصوبہ کا افتتاح کرایا ہے۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔ اومان کے سلطان قابوس نے اسرائیلی وزیراعظم نیتن یاہو کا اپنے ملک میں استقبال کیا ہے اور کہا ہے کہ اب اسرائیل کو تسلیم کرنے کا وقت آ گیا ہے۔ اسرائیل اور سعودی عرب میں محبت کی پینگیں پڑ چکی ہیں اور تعلقات میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے۔ پاکستان کی قومی اسمبلی میں ایک خاتون رکن جو حکومتی بینچوں سے تعلق رکھتی ہیں‘ وہ پاکستانیوں کو یہودیوں سے اچھے سلوک کا سبق پڑھا رہی ہیں۔ امریکہ اور برازیل یروشلم میں اپنے سفارت خانے منتقل کر چکے ہیں جس پر عرب ممالک نے چوں تک نہیں کی۔ فلسطینیوں کو ان کے گھروں سے نکال کر یہودی آبادکاروں کو پہلے خاموشی سے آباد کیا جا رہا تھا‘ اب اسرائیل اعلانیہ اور بھرپور طریقے سے یہ کام کر رہا ہے۔ عالمی میڈیا‘ عالمی اسٹیبلشمنٹ اور عالمی معیشت یہودیوں کے کنٹرول میں ہے اور دنیا خواہی نخواہی یہودیوں کے اشاروں پر ناچ رہی ہے۔ گویا گریٹر اسرائیل کا قیام اور یہودی مفادات کو ترجیح اوّل حاصل ہے‘ باقی سب کچھ ثانوی ہے۔

امریکہ نے ایران پر پابندیاں عائد کر دی ہیں۔ میری ذاتی رائے میں امریکہ اور ایران کے مابین سو میں سے ننانوے معاملات میں مکمل اتفاق اور تعاون ہے‘ لیکن ایک اختلاف نے تعلقات میں بگاڑ پیدا کر رکھا ہے اور وہ ہے ایران کا ایٹمی صلاحیت کے قریب جانا‘ کیونکہ اس سے اسرائیل کو خطرہ لاحق ہوتا ہے۔ اسرائیل کے اس غیر منطقی اور فرضی خطرے کو امریکہ اتنی اہمیت دیتا ہے کہ وہ ایران کے ساتھ اپنے تمام اتفاقات اور مفادات کو قربان کرنے کو تیار ہے اور ایران کا دشمن بن کر سامنے کھڑا ہے۔

امریکہ اور چین کے درمیان تجارتی جنگ ایک عرصہ سے نچلی سطح پر جاری تھی‘ ٹرمپ کے امریکہ کا صدر بننے کے بعد اس جنگ میں بہت تیزی آ گئی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ چائنا کی بڑھتی ہوئی معاشی قوت نے امریکہ کو باؤلا کر دیا ہے۔ چین کا سی پیک اور BRI یعنی (Belt and Road Initiaive) نے امریکہ کی نیند حرام کی ہوئی ہے۔ ساؤتھ چائنا سمندر اور بحرالکاہل میں چین کے منصوبے امریکہ کو کسی طرح قبول نہیں۔ اس وقت صورتِ حال یہ ہے کہ امریکہ چین کو

محصور کرنا اور گھیرنا چاہتا ہے اور چین پھیلنا چاہتا ہے‘ لیکن چین امریکہ کی طرح دوسرے ممالک میں مار دھاڑ اور اُن کی سرزمین پر ناجائز قبضے کرنے کا قائل نہیں‘ البتہ وہ دنیا پر معاشی کنٹرول حاصل کرتا جا رہا ہے‘ جو ایک دن امریکہ کی عالمی بادشاہت کے لیے موت کا سبب بن سکتا ہے۔

امریکہ اور پاکستان کے تعلقات عجب کیفیت میں ہیں۔ اِس کی دو مختلف سمتیں ہیں۔ ایک طرف امریکہ پاکستان کو بُری طرح دبا رہا ہے۔ ٹرمپ اور اس کی حکومت کے اعلیٰ عہدے دار پاکستان کے خلاف دھمکی آمیز بیانات بھی دے رہے ہیں اور امریکہ پاکستان کی ہر قسم کی مالی امداد بھی بند کر رہا ہے۔ لیکن دوسری طرف اِس خطے میں اپنے وجود کو برقرار رکھنے کے لیے پاکستان اُس کے لیے ناگزیر بھی ہے۔ یہ امر یقیناً ہمارے لیے بڑی خوشی کا باعث ہے کہ افغانستان میں امریکہ کو مسلسل پسپائی کا سامنا ہے اور افغان طالبان آگے بڑھ رہے ہیں۔ افغانستان کے ایک بڑے حصہ پر یا تو اُن کا قبضہ ہے یا وہ اُن کے زیر اثر ہے اور وہاں افغان حکومت کی رٹ نہیں ہے‘ لیکن نتائج کے اعتبار سے دو بڑی خطرناک باتیں سامنے آ رہی ہیں۔ ایک یہ کہ امریکہ افغان جنگ کی نجکاری کرتا نظر آ رہا ہے‘ بلیک واٹر جیسی تنا ظیم اِس جنگ کو خریدنا چاہتی ہیں۔ اس کا صاف صاف مطلب ہے کہ افغانستان میں زبردست خونریزی کی جائے گی۔ بلیک واٹر جو داعش سے بڑھ کر قتل و غارت کے قائل ہیں وہ اس جنگ کو خریدنے کے لیے زبردست لابنگ کر رہے ہیں۔

دوسری بات یہ ہے کہ امریکہ کا ماضی بتاتا ہے کہ اگر اُسے کسی چھوٹے ملک کے مقابلے میں پسپائی کا سامنا کرنا پڑے تو وہ سارا غصہ ہمسایہ ملک پر نکالتا ہے‘ جیسے اُس نے ویت نام سے نکلتے ہوئے ویت نام کے ہمسائے کمبوڈیا کو تباہ و برباد کر دیا تھا۔ پاکستان کے بارے میں غلط یا صحیح تمام امریکی مکمل طور متفق ہیں کہ اُن کی شکست کا باعث صرف اور صرف پاکستان ہے‘ لہٰذا وہ افغانستان کے ہمسائے پاکستان پر سخت برہم ہیں۔ پھر یہ کہ پاکستان ایک ایٹمی اسلامی ملک ہے اور کسی وقت اسرائیل کے لیے خطرناک ثابت ہو سکتا ہے‘ لہٰذا پاکستان سے نمٹنا اور اُس کی یہ صلاحیت ختم کرنا امریکہ کی ترجیح اوّل ہے۔ پاکستان سے کمبوڈیا جیسا سلوک کرنا امریکہ کے لیے ممکن نہیں‘ اس لیے کہ ایسی صورت میں بھارت اور اسرائیل جیسے امریکہ کے دوست پاکستان کی ایٹمی قوت کا نشانہ بن سکتے ہیں۔ لیکن کیا امریکہ پاکستان کو مکمل طور پر معاف

کر دے گا؟ یہ سوچنا بھی حماقت ہے۔ امریکہ پاکستان کے ذریعے آخری کوشش کرے گا کہ افغان طالبان سے مذاکرات ہوں اور اُسے یقینی طور پر افغانستان سے نکلنے کا باعزت راستہ مل جائے۔ ۹ نومبر کو جو روس میں امریکہ‘ افغان طالبان‘ پاکستان‘ بھارت اور چین کے افغان مسئلہ پر مذاکرات ہوئے ہیں وہ اسی کی ایک کڑی ہے۔

میری ذاتی رائے میں افغان مسئلہ کا حل جلد نکلتے نظر نہیں آتا۔ اِس لیے کہ امریکہ افغانستان سے نکلنے کے حوالے سے مخلص نہیں اور افغان طالبان کا اپنے اس موقف سے کہ ’’بیرونی قوتیں افغانستان سے نکل جائیں‘‘ پیچھے ہٹنا ممکن نہیں۔ افغانستان کی حکومت بھی امریکی افواج کا مکمل انخلا نہیں چاہتی‘ اس لیے کہ وہ بھی جانتی ہے کہ اگر امریکہ مکمل طور پر نکل گیا تو وہ افغان طالبان کے سامنے ٹھہر نہیں سکیں گے۔ لہٰذا میں آپ کو یہ بتانا چاہتا ہوں کہ اگر فوجی حل نہیں نکلتا‘ جیسا کہ توقع ہے کہ نہیں نکل سکے گا اور مذاکرات بھی مکمل طور پر ناکام ہوتے ہیں‘ تو پھر پاکستان پر بھرپور وار کیا جائے گا۔ آپ جانتے ہیں کہ پاکستان میں شیعہ‘ سنی فسادات کرانے کی کوشش کی گئی‘ یہاں قبائلیوں اور فوج کو لڑانے کی کوشش کی گئی۔ معلوم یوں ہوتا ہے کہ اب اللہ نہ کرے‘ میرے منہ میں خاک‘ توہین رسالت کے واقعات کروائے جائیں گے اور پُرجوش لوگوں کے ذریعے عوام اور فوج کو آمنے سامنے لانے کی کوشش کی جائے گی۔ لہٰذا مسلمانانِ پاکستان اِس سازش کا بھی توڑ کریں۔ خاص طور پر حکمران ہوش کے ناخن لیں۔ ریاست کی رٹ قائم ضرور کریں‘ لیکن اس کی آڑ میں تشدد کا راستہ اختیار نہ کریں اور خوش اسلوبی سے معاملات نمٹائیں۔ اِس نکتہ پر خود کو فوکس کریں کہ دشمن کو اگر کھلم کھلا حملہ نہ کرنے کی مجبوری ہے تو وہ پاکستان میں شام جیسے حالات پیدا کرنے کی بھرپور کوشش کرے گا۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ مسلمانانِ پاکستان دشمنوں کی اِس سازش کو بھی ناکام بنا دیں۔

کشمیر کا ذکر کرتے ہوئے دل بہت دُکھتا ہے۔ بھارت کشمیریوں پر ستر سال سے ظلم ڈھا رہا ہے‘ لیکن اب بھارت اپنے سیاسی اُستاد اور ریاستی دہشت گردی میں پارٹنر اسرائیل سے راہنمائی لے رہا ہے۔ جس طرح اسرائیل کہتا ہے کہ اُسے فلسطینیوں کی نہیں سرزمین فلسطین کی ضرورت ہے‘ یہی سبق بھارت نے بھی سیکھ لیا ہے اور وہ اس سٹرٹیجی پر عمل کر رہا ہے کہ کوئی کشمیری زندہ رہے نہ رہے‘ ہمیں (یعنی بھارت کو) سرزمین کشمیر سے تعلق ہے۔ لہٰذا کشمیر میں ظلم اب

انتہا کو پہنچ گیا ہے اور وہ انسانیت کا جنازہ نکال رہا ہے۔ پیلٹ گن سے لوگوں کو اندھا کر رہا ہے‘ جنازوں پر فائرنگ کر رہا ہے‘ خواتین کی بے حرمتی کر رہا ہے۔ پاکستان ایک اسلامی فلاحی ریاست بن جاتا تو وہ کشمیری جو ’’پاکستان سے رشتہ کیا؟ لا الٰہ الا اللہ‘‘ کا نعرہ لگا رہے ہیں‘ آج اُن کی تحریک میں ایسا ولولہ پیدا ہو جاتا کہ بھارتی افواج اُسے کچلنے میں آسانی سے کامیاب نہ ہوسکتیں۔ گویا میں کہنا چاہتا ہوں کہ کشمیریوں پر جو آج ظلم وستم کے پہاڑ توڑے جا رہے ہیں‘ ہم پاکستانی بھی بحیثیت مجموعی اِس کے ذمہ دار ہیں۔

امریکہ اور بھارت کے تعلقات ظاہراً بہت اچھے جا رہے ہیں‘ لیکن امریکہ بھارت کی عملی کارکردگی سے کوئی زیادہ خوش نہیں۔ بھارت نے امریکہ کی زبردست مخالفت کے باوجود روس سے S-400 میزائل سسٹم کا معاہدہ کرلیا ہے۔ چین کا BRI تجارتی منصوبہ دنیا میں اپنے تجارتی پنجے گاڑنے کا ایک ذریعہ ہے۔ BRI کا یہ روٹ اِس وقت دنیا میں استعمال ہونے والے تجارتی روٹ سے ہٹ کر ہے‘ لہٰذا موجودہ تجارتی روٹ سے استفادہ کرنے والے اس کے سخت خلاف ہیں‘ جن میں امریکہ‘ مغربی یورپ اور بھارت وغیرہ شامل ہیں۔

اب آجایئے پاکستان کے اندرونی حالات پر۔ عمران خان نے پہلے سودن میں پاکستان کا رُخ متعین کرنے کا وعدہ کیا تھا‘ جس میں وہ جزوی طور پر کامیاب رہے‘ البتہ بعض معاملات میں اُنہیں ناکامی کا سامنا ہے۔ سب سے بڑی ناکامی اس حوالے سے ہے کہ پاکستان کو ریاستِ مدینہ کے مثل ایک ریاست بنانے کا دعویٰ تھا۔ ہم یہ مطالبہ نہیں کرتے کہ اب تک یہ مدینہ کی ریاست کیوں نہیں بنی‘ بلکہ ہمارا اعتراض یہ ہے کہ پہلے سودن میں آپ نے کون سا قدم ایسا اُٹھایا ہے جس کے بارے میں کہا جائے کہ ریاستِ مدینہ کی تشکیل کے حوالے سے یہ پہلا ابتدائی قدم ہے۔ مجھے تو یوں دکھائی دیتا ہے کہ فی الحال ہم اُس منزل کی طرف پیٹھ کر کے کھڑے نظر آتے ہیں۔ قانون سازی جو اسمبلیوں کا اصل کام ہے وہ ابھی شروع بھی نہیں ہوسکا‘ البتہ گالم گلوچ اور باہم طعن بازی اسمبلیوں میں بڑے زور وشور سے جاری وساری ہے۔ تجارتی کر نٹ خسارہ قریباً ۱۲ ارب ڈالر ماہانہ ہے۔ بجٹ کا خسارہ ۲۰۱۸ء تک ۲۲ کھرب روپے سے زائد ہو چکا ہے جو کہ پاکستان کی مجموعی پیداوار یعنی G.D.P کا ۶.۵ فیصد ہے۔ بہرحال وزیراعظم پاکستان کے سعودی عرب کے دوسرے دورے میں کشکول میں کچھ نقد پڑ گیا اور تین سال کے

لیے مؤخر ادائیگی پر تیل ملنا طے ہوگیا‘ جو ہمیں اس ہنگامی صورتِ حال سے وقتی طور پر نکلنے میں مددگار ثابت ہوگا۔ چونکہ محمد بن سلطان جمال خاشقجی کے قتل کی وجہ سے بیک فٹ پر تھا اور زیادہ سے زیادہ ممالک کی حمایت حاصل کرنا چاہتا تھا‘ جس کا بھی شاید پاکستان کو فائدہ پہنچا۔

جہاں تک چین کے دورے کا تعلق ہے‘ وہ نہایت سمجھ دار قوم ہے اور وہ اپنے مفادات کا تحفظ کرنا جانتی ہے‘ لہٰذا چین نے عمران خان کے دورے پر مدد کا مختلف انداز اختیار کیا‘ جس پر شور مچ گیا کہ عمران خان کا دورۂ چین ناکام ہوگیا۔ چین کے دورے کے دوران ۱۵ معاہدوں پر دستخط ہوئے‘ جن میں (۱) غربت کا خاتمہ (۲) زرعی ترقی (۳) صنعتی تعاون (۴) دفاع (۵) ٹیکنیکل ٹریننگ وغیرہ شامل ہیں۔ بیل آؤٹ پیکج کے سلسلے میں چین اور پاکستان میں مزید بات چیت ہوگی (جو شروع ہو چکی ہے) پاکستان اور چین کی باہمی تجارت Yuan (چینی کرنسی) میں ہوگی‘ جس سے ڈالر پر انحصار مستقبل میں کم ہوسکتا ہے۔ اِسے ایک کامیابی قرار دیا جاسکتا ہے۔ چین پاکستان میں خصوصی معاشی زون قائم کرے گا۔ علاوہ ازیں چینی ویزے میں رعایت کا فیصلہ ہوگا۔ وزیراعظم کے پانچ روزہ دورے میں روس کے وزیراعظم سے بھی ملاقات ہوئی اور وسطی ایشیائی ریاستوں کے سربراہان سے بھی۔ دورے کے بارے میں مختلف لوگوں کی مختلف آراء ہیں۔ میری رائے میں یہ دورہ شارٹ ٹرم میں ایسا کامیاب نہیں ہے‘ البتہ لانگ ٹرم میں پاکستان کی معیشت کو مستحکم کرنے میں یقیناً سودمند رہے گا۔

بہرحال جب تک پاکستان اقتصادی لحاظ سے خودکفیل نہیں ہوتا‘ اسلامی ریاست تو دور کی بات ہے‘ پاکستان مکمل آزاد ریاست بھی نہیں بن سکتا۔

❁❁❁

اطلاع برائے قارئین

قارئین میثاق کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ کاغذ کی قیمتوں اور طباعت کے اخراجات میں اضافے کے پیش نظر جنوری 2019ء سے قیمت فی شمارہ 40 روپے اور سالانہ زرتعاون 400 روپے کیا جا رہا ہے۔ (مدیر مکتبہ)

دورۂ ترجمۂ قرآن

ڈاکٹر اسرار احمد

سُورۃُ الصّٰفّٰت

آیات ۷۵ تا ۱۱۳

وَلَقَدْ نَادٰىنَا نُوْحٌ فَلَنِعْمَ الْمُجِيْبُوْنَ ۖ وَنَجَّيْنٰهُ وَاَهْلَهٗ مِنَ الْكَرْبِ
الْعَظِيْمِ ۖ وَجَعَلْنَا ذُرِّيَّتَهٗ هُمُ الْبٰقِيْنَ ۖ وَتَرَكْنَا عَلَيْهِ فِي الْاٰخِرِيْنَ ۖ
سَلٰمٌ عَلٰى نُوْحٍ فِي الْعٰلَمِيْنَ ۝ اِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ ۝ اِنَّهٗ مِنْ
عِبَادِنَا الْمُؤْمِنِيْنَ ۝ ثُمَّ اَغْرَقْنَا الْاٰخَرِيْنَ ۝ وَاِنَّ مِنْ شِيْعَتِهٖ لَاِبْرٰهِيْمَ ۘ
اِذْ جَآءَ رَبَّهٗ بِقَلْبٍ سَلِيْمٍ ۝ اِذْ قَالَ لِاَبِيْهِ وَقَوْمِهٖ مَاذَا تَعْبُدُوْنَ ۚ اَئِفْكًا
اٰلِهَةً دُوْنَ اللّٰهِ تُرِيْدُوْنَ ۝ فَمَا ظَنُّكُمْ بِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ فَنَظَرَ نَظْرَةً فِي
النُّجُوْمِ ۙ فَقَالَ اِنِّيْ سَقِيْمٌ ۝ فَتَوَلَّوْا عَنْهُ مُدْبِرِيْنَ ۝ فَرَاغَ اِلٰٓى اٰلِهَتِهِمْ
فَقَالَ اَلَا تَاْكُلُوْنَ ۚ مَا لَكُمْ لَا تَنْطِقُوْنَ ۝ فَرَاغَ عَلَيْهِمْ ضَرْبًا
بِالْيَمِيْنِ ۝ فَاَقْبَلُوْٓا اِلَيْهِ يَزِفُّوْنَ ۝ قَالَ اَتَعْبُدُوْنَ مَا تَنْحِتُوْنَ ۙ وَاللّٰهُ
خَلَقَكُمْ وَمَا تَعْمَلُوْنَ ۝ قَالُوا ابْنُوْا لَهٗ بُنْيَانًا فَاَلْقُوْهُ فِي الْجَحِيْمِ ۝ فَاَرَادُوْا
بِهٖ كَيْدًا فَجَعَلْنٰهُمُ الْاَسْفَلِيْنَ ۝ وَقَالَ اِنِّيْ ذَاهِبٌ اِلٰى رَبِّيْ سَيَهْدِيْنِ ۝
رَبِّ هَبْ لِيْ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ ۝ فَبَشَّرْنٰهُ بِغُلٰمٍ حَلِيْمٍ ۝ فَلَمَّا بَلَغَ مَعَهُ
السَّعْيَ قَالَ يٰبُنَيَّ اِنِّيْٓ اَرٰى فِي الْمَنَامِ اَنِّيْٓ اَذْبَحُكَ فَانْظُرْ مَاذَا تَرٰى ۭ
قَالَ يٰٓاَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ ۡ سَتَجِدُنِيْٓ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ مِنَ الصّٰبِرِيْنَ ۝
فَلَمَّآ اَسْلَمَا وَتَلَّهٗ لِلْجَبِيْنِ ۚ وَنَادَيْنٰهُ اَنْ يّٰٓاِبْرٰهِيْمُ ۙ قَدْ صَدَّقْتَ
الرُّءْيَا ۚ اِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ ۝ اِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْبَلٰٓؤُا الْمُبِيْنُ ۝
وَفَدَيْنٰهُ بِذِبْحٍ عَظِيْمٍ ۝ وَتَرَكْنَا عَلَيْهِ فِي الْاٰخِرِيْنَ ۝ سَلٰمٌ عَلٰٓى

اِبْرٰهِيْمَ ۝ كَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ ۝ اِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُؤْمِنِيْنَ ۝
وَبَشَّرْنٰهُ بِاِسْحٰقَ نَبِيًّا مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ ۝ وَبٰرَكْنَا عَلَيْهِ وَعَلٰٓى اِسْحٰقَ ۭ
وَمِنْ ذُرِّيَّتِهِمَا مُحْسِنٌ وَّظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ مُبِيْنٌ ۝

آیت ۷۵ ﴿وَلَقَدْ نَادٰىنَا نُوْحٌ فَلَنِعْمَ الْمُجِيْبُوْنَ ۝﴾ ’’اور ہمیں پکارا تھا نوحؑ نے‘ تو ہم کیا ہی اچھے دعا قبول کرنے والے ہیں!‘‘

حضرت نوح علیہ السلام کی اس دعا کا ذکر سورۃ القمر میں ان الفاظ میں ہوا ہے: ﴿فَدَعَا رَبَّهٗٓ اَنِّيْ مَغْلُوْبٌ فَانْتَصِرْ ۝﴾ یعنی اُس نے ربّ سے فریاد کی کہ میں مغلوب ہو گیا ہوں‘ انہوں نے مجھے دبا لیا ہے‘ اب تُو ہی میری مدد فرما اور تو ہی ان سے میرا بدلہ لے! چنانچہ اللہ کی مدد آ گئی۔

آیت ۷۶ ﴿وَنَجَّيْنٰهُ وَاَهْلَهٗ مِنَ الْكَرْبِ الْعَظِيْمِ ۝﴾ ’’اور ہم نے نجات دی اُس کو اور اُس کے گھر والوں کو کربِ عظیم سے۔‘‘

یہ ’’کربِ عظیم‘‘ کیا تھا؟ اس کو سمجھنے کے لیے حضرت نوح علیہ السلام کی قوم اور معاشرے کے حالات کی تصویر ذہن میں لائیے۔ چشمِ تصوّر سے دیکھئے کہ کس طرح اللہ کا ایک بندہ لوگوں تک اللہ کا پیغام پہنچا رہا ہے۔ اس کے لیے وہ دن دیکھتا ہے نہ رات۔ اجتماعی دعوت بھی دے رہا ہے‘ انفرادی ملاقاتیں بھی کر رہا ہے‘ ہر موقع آزما رہا ہے‘ ہر ذریعہ اور ہر طریقہ بروئے کار لا رہا ہے‘ جبکہ جواب میں اس کی اپنی قوم کے لوگ مسلسل اس سے استہزاء کر رہے ہیں‘ اس کا تمسخر اڑا رہے ہیں اور اس پر پھبتیاں کس رہے ہیں۔ اس جان لیوا جدوجہد میں دس بیس یا پچاس برس تک نہیں‘ پورے ساڑھے نو سو سال تک اپنی جان کو گھلاتے چلے جانا اور اس کے جواب میں قوم کے مخالفانہ رویے کا سامنا کرنا اور پھر اس مخالفت پر صبر کرنا کوئی معمولی کرب اور ضیق نہیں تھا۔

اسی طرح کے کرب اور ضیق کا سامنا محمد رسول اللہ ﷺ کو مکی دور میں اُس وقت کرنا پڑا تھا جب مشرکین بار بار کسی معجزے کا مطالبہ کر کے آپؐ پر گویا اتمامِ حجت کر رہے تھے۔ ان کا اصرار تھا کہ اگر آپ اللہ کے رسول ہیں تو ہمیں ایسے معجزات دکھائیں جیسے حضرت موسیٰؑ اور حضرت عیسیٰؑ نے اپنی قوموں کو دکھائے تھے۔ اس حوالے سے آپؐ پر عوام کا دباؤ مسلسل بڑھتا جا رہا تھا‘ جبکہ اللہ کا فیصلہ اس حوالے سے یہ تھا کہ اس طرح کا کوئی حسّی معجزہ نہیں دکھایا جائے گا۔ اس صورتِ حال میں آپ ﷺ گویا چکّی کے دو پاٹوں کے درمیان آ چکے تھے۔ سورۃ الانعام کے مطالعے کے دوران حضور ﷺ کے اس کربِ عظیم کی کیفیت کے بارے میں ہم پڑھ چکے ہیں۔

سورۃ الانعام کی متعلقہ آیات اس موضوع پر گویا ذروۂ سنام (climax) کا درجہ رکھتی ہیں۔ چنانچہ آیت زیر مطالعہ میں اہل ایمان کو گویا اشارۃً بتایا جا رہا ہے کہ تم لوگوں کو تو ابھی راہِ حق میں سختیاں جھیلتے ہوئے صرف دس بارہ سال ہی ہوئے ہیں۔ اپنی تکلیفوں کے بارے میں سوچتے ہوئے ذرا ہمارے بندے نوحؑ کے صبر و استقامت کو بھی مدِّنظر رکھو جو ساڑھے نو سو سال تک اس طرح کے ''کرب'' کا سامنا کرتے رہے۔ اس میں اس امر کی طرف بھی اشارہ ہے کہ جس طرح نوح علیہ السلام اور ان کے اہلِ ایمان ساتھیوں کو اُس کربِ عظیم سے بچایا گیا' اسی طرح آخر کار محمدٌ رسول اللہ ﷺ اور ان کے ساتھیوں کو بھی ہم اس کربِ عظیم سے نجات دلائیں گے جس میں اہلِ مکّہ نے ان کو مبتلا کر رکھا ہے۔

پھر پانی کا عذاب بذاتِ خود ایک ''کربِ عظیم'' تھا جو حضرت نوح علیہ السلام کی قوم پر مسلّط ہوا تھا۔ یعنی یوں تو نہیں ہوا ہوگا کہ سیلاب آیا اور حق کے مخالفین سب کے سب آنِ واحد میں غرق ہو گئے۔ آج بھی اگر ہم اس خوفناک صورت حال کی تصویر اپنے ذہنوں میں لا کر غور کریں تو ہم اندازہ کر سکتے ہیں کہ اس سیلابِ بلا کی انتہائی غیر معمولی صورتِ حال کو دیکھ کر وہ لوگ تشویش و تفکّر کے کون کون سے مراحل سے گزرے ہوں گے' کیسی کیسی حفاظتی تدابیر لڑائی گئی ہوں گی' جانیں بچانے کے لیے کیا کیا بھگدڑ اور ہلچل مچی ہوگی۔ گویا سیلاب کی وجہ سے اس قوم کے لیے قیامتِ صُغریٰ کا منظر ہوگا۔ اور کسی نہ کسی درجے میں ﴿اِنَّ زَلْزَلَةَ السَّاعَةِ شَيْءٌ عَظِيْمٌ ۝۱﴾ (الحج) کی سی کیفیت پیدا ہو گئی ہوگی۔ یہ سب کچھ بذاتِ خود ایک ''کربِ عظیم'' تھا' جس کا سامنا حضرت نوح علیہ السلام اور آپؑ کے ساتھیوں کو بھی تھا' لیکن اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل خاص سے انہیں اس ''کربِ عظیم'' سے محفوظ رکھا۔

آیت ۷۷ ﴿وَجَعَلْنَا ذُرِّيَّتَهٗ هُمُ الْبٰقِيْنَ ۝۷۷﴾ ''اور ہم نے اُس کی اولاد کو ہی باقی رہنے والا بنایا۔''

یہ آیت فلسفہ قرآنی کے اعتبار سے بہت اہم ہے۔ اس میں اسلوبِ حصر کے ساتھ فرمایا گیا ہے کہ صرف نوح علیہ السلام ہی کی اولاد کو ہم نے باقی رہنے والا بنایا۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ سیلاب کے بعد دنیا میں بنی نوعِ انسان کی نسل صرف حضرت نوح علیہ السلام کے بیٹوں سے ہی چلی تھی۔

آپؑ کی قوم کے رویے کے حوالے سے قرآن میں جا بجا جو اشارے ملتے ہیں اس سے تو یہی گمان ہوتا ہے کہ ان لوگوں میں سے شاید کوئی بھی آپؑ پر ایمان نہیں لایا تھا۔ بلکہ سورۂ ہود

کے الفاظ: ﴿وَمَآ اٰمَنَ مَعَهٗٓ اِلَّا قَلِيْلٌ ۝۴۰﴾ سے تو ایسے ہی لگتا ہے جیسے کشتی میں گنتی کے چند افراد تھے جن میں آپؑ خود تھے' آپؑ کے تین بیٹے اور ان کے اہل و عیال تھے یا ممکن ہے آپؑ کی کوئی بیوی بھی آپؑ کے ہمراہ ہو۔ اس کے علاوہ کچھ خادمین اور ملازمین ہوں گے اور بس۔ آپؑ کی ایک بیوی اور ایک بیٹا تو غرق ہونے والوں میں شامل تھے۔ اگر کوئی خُدّام وغیرہ تھے بھی تو ان کی نسل آگے چلنے کا اہتمام نہیں ہوا ہوگا۔ چنانچہ اس کے بعد نسل انسانی آپؑ کے تین بیٹوں سامؑ' حامؑ اور یافثؑ سے ہی چلی۔ اسی لیے آپؑ کو آدمِ ثانی بھی کہا جاتا ہے۔ میرے اندازے کے مطابق تقریباً دو ہزار برس کے عرصے میں انسانی آبادی دنیا کے مختلف علاقوں میں پھیلی ہے۔ ورنہ حضرت نوح علیہ السلام کے زمانے تک انسانی آبادی صرف اُسی علاقے تک محدود تھی جو سب کی سب سیلاب کی وجہ سے ختم ہو گئی اور صرف وہی چند نفوس زندہ بچے جو آپؑ کے ساتھ کشتی میں سوار تھے۔ بہرحال آیت زیر مطالعہ کے الفاظ میں یہ مفہوم بہت واضح ہے کہ سیلاب کے بعد نسلِ انسانی صرف آپؑ کے بیٹوں (ذُرِّيَّتَهٗ) سے ہی آگے چلی۔ کشتی میں اگر آپؑ کے خاندان کے علاوہ کچھ اور لوگ موجود تھے بھی تو ان میں سے کسی کی نسل آگے نہ چل سکی۔

آیت ۷۸ ﴿وَتَرَكْنَا عَلَيْهِ فِي الْاٰخِرِيْنَ ۝۷۸﴾ ''اور ہم نے اسی (کے طریقے) پر بعد میں آنے والوں میں سے بھی (کچھ لوگوں کو) چھوڑا۔''

یعنی بعد میں آپؑ کی نسل میں سے بھی لوگ آپؑ کے راستے پر چلتے رہے۔ آپؑ کے بیٹوں کی اولادیں کچھ عرصہ تک تو یقیناً دینِ حق اور دینِ توحید پر چلتی رہی ہوں گی' لیکن بالآخر شیطان نے انہیں بھی گمراہ کر دیا اور مختلف قسم کے توہمات اور شرک میں مبتلا کر دیا۔

آیت ۷۹ ﴿سَلٰمٌ عَلٰى نُوْحٍ فِي الْعٰلَمِيْنَ ۝۷۹﴾ ''سلام ہو نوحؑ پر تمام جہانوں میں!''

آیت ۸۰ ﴿اِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ ۝۸۰﴾ ''یقیناً ہم اسی طرح بدلہ دیا کرتے ہیں محسنین کو۔''

''محسن'' وہ شخص ہے جو اسلام اور ایمان کے مدارج طے کر کے درجہ احسان تک پہنچ جائے۔

آیت ۸۱ ﴿اِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُؤْمِنِيْنَ ۝۸۱﴾ ''یقیناً وہ ہمارے مؤمن بندوں میں سے تھا۔''

آیت ۸۲ ﴿ثُمَّ اَغْرَقْنَا الْاٰخَرِيْنَ ۝۸۲﴾ ''پھر ہم نے غرق کر دیا باقی سب کو۔''

آیت ۸۳ ﴿وَاِنَّ مِنْ شِيْعَتِهٖ لَاِبْرٰهِيْمَ ۝۸۳﴾ ''اور اُسی کی جماعت میں سے ابراہیمؑ

بھی تھا۔‘‘

یعنی حضرت ابراہیم علیہ السلام اسی دین حق اور نظریۂ توحید کے پیروکار تھے جس پر حضرت نوح علیہ السلام کاربند تھے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا تعلق حضرت نوح علیہ السلام کے بیٹے حضرت سام کی نسل سے تھا۔ اسی طرح قومِ عاد اور قومِ ثمود بھی سامی النسل تھیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی پیدائش شہر اُر میں ہوئی جو موجودہ عراق کے جنوبی علاقے میں اپنے وقت کا مشہور شہر تھا۔ اس شہر کے کھنڈرات دریافت ہو چکے ہیں۔

آیت ۸۴ ﴿اِذْ جَآءَ رَبَّهٗ بِقَلْبٍ سَلِيْمٍ ﴿۸۴﴾﴾ ’’جب وہ اپنے رب کی طرف متوجہ ہوا قلبِ سلیم کے ساتھ۔‘‘

توحید کی معرفت کے حوالے سے انسان کی فطرتِ سلیمہ اور عقل سلیم کا ذکر قرآن حکیم کے اس مطالعے کے دوران اس سے پہلے بھی متعدد بار ہو چکا ہے۔ فطرت کا تعلق چونکہ روح سے ہے اور روح کا مسکن قلب انسانی ہے اس لیے یوں سمجھ لیں کہ فطرتِ سلیمہ اور قلب سلیم انسان کی ایک ہی کیفیت کا نام ہے۔ یعنی انسانی دل کی وہ کیفیت جس میں اس کی روح اور فطرت اپنی اصلی حالت میں ہو‘ اس کے اصل خدوخال صحیح سلامت ہوں‘ اس پر غفلت اور مادیت کے پردے نہ پڑ چکے ہوں اور وہ مسخ (perverted) نہ ہو چکی ہو۔ انسانی فطرت کی اس کیفیت کے لیے صوفیاء ’’سیر الی اللہ‘‘ کی اصطلاح استعمال کرتے ہیں۔

ایک انسان ایسے قلب سلیم کے ساتھ جب اللہ کی طرف رجوع کرتا ہے تو عقل سلیم کی روشنی میں اسے توحید کی معرفت حاصل ہو جاتی ہے۔ پھر وہ اس سے آگے بڑھ کر ’’معاد‘‘ یعنی آخرت کے فلسفے کی تہہ تک بھی پہنچ جاتا ہے۔ اس حوالے سے میں قبل ازیں متعدد بار سورۃ الفاتحہ کا حوالہ بھی دے چکا ہوں کہ سورۃ الفاتحہ ایک ایسے ہی انسان کی فطرت کی پکار ہے جو اللہ اور توحید کی معرفت بھی حاصل کر چکا ہے‘ آخرت کی اہمیت وضرورت کا بھی قائل ہو چکا ہے اور اس نتیجے پر بھی پہنچ چکا ہے کہ ’’اللہ کی بندگی‘‘ ہی اصل طریقۂ زندگی ہے‘ مگر اُسے یہ نہیں معلوم کہ اللہ کی بندگی کیسے کی جائے۔ حضور ﷺ کی بعثت سے پہلے بہت سے ایسے ’’موحدین‘‘ مکہ میں موجود تھے۔ مثلاً حضرت عمر کے بہنوئی حضرت سعید رضی اللہ عنہما کے والد زید ایک ایسے ہی موحد تھے جو کعبے کے پردوں سے لپٹ کر دعا کیا کرتے تھے کہ اے اللہ! میں صرف تیری بندگی کرنا چاہتا ہوں‘ مگر میں نہیں جانتا کہ تیری بندگی کیسے کروں۔

سورۃ الفاتحہ کے نظم پر غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ انسانی فطرتِ سلیمہ ہی کی پکار ہے جس کو قرآن نے ﴿اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ۝۵﴾ کے الفاظ عطا کیے ہیں۔ یعنی فطرتِ سلیمہ کا حامل ایک انسان اپنی عقل سلیم کی مدد سے ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝۱﴾ تک پہنچ گیا۔ یعنی اس نے اللہ کو پہچان لیا ہے اور اس کے لیے شکر وثنا کے جذبات کی کونپلیں بھی اس کے دل میں پھوٹ پڑی ہیں۔ اُس نے اپنے اللہ اور اپنے رب کو ایک ﴿الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۝۲﴾ ذات کے طور پر بھی پہچان لیا ہے‘ اسے ﴿مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ ۝۳﴾ کا عرفان بھی حاصل ہو گیا ہے۔ گویا اُس کی فطرتِ سلیمہ نے نہ صرف اسے آخرت کے احتساب کی ضرورت اور منطق بھی سمجھا دی ہے‘ بلکہ یہ لطیف نکتہ بھی اس کے دل میں بٹھا دیا ہے کہ وہی اللہ جو ربّ العالمین ہے‘ جس کی رحمت اور مہربانی سے اس کائنات کی ایک ایک چیز قائم ہے‘ وہی اللہ احتساب اور بدلے کے دن کا مالک بھی ہے۔ اس مقام پر پہنچ کر گویا اُس کی زبان بے اختیار ﴿اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ ۝۴﴾ کا اقرار کرتی ہے‘ مگر اس سے آگے اسے کچھ بجھائی نہیں دیتا۔ اس لیے کہ اس کی فطرتِ سلیمہ اس راستے پر اسے صرف اسی مقام تک راہنمائی فراہم کر سکتی تھی اور اس کی عقل سلیم کی پرواز بس یہیں تک تھی۔ اس سے آگے نورِ وحی کی راہنمائی درکار ہے۔ چنانچہ اس کے منہ میں یہ دعائیہ الفاظ ڈال دیے گئے: ﴿اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ۝۵﴾ کہ اے اللہ! اے ربّ العالمین! اب تو خود ہماری دستگیری فرما! ہمیں اپنی بندگی کی ہدایت بھی دے اور اس رستے پر چلنے کے لیے مدد اور توفیق بھی مرحمت فرما‘ تاکہ ہم تیری بندگی کا حق ادا کر سکیں۔ اس دعا کے جواب میں پھر قرآن کی صورت میں اسے یہ راہنمائی مہیا کر دی گئی۔

آیت ۸۵ ﴿اِذْ قَالَ لِاَبِيْهِ وَقَوْمِهٖ مَاذَا تَعْبُدُوْنَ ﴿۸۵﴾﴾ ’’جب کہ اُس نے اپنے والد اور اپنی قوم سے کہا کہ تم لوگ کن چیزوں کو پوجتے ہو!‘‘

آیت ۸۶ ﴿اَئِفْكًا اٰلِهَةً دُوْنَ اللّٰهِ تُرِيْدُوْنَ ﴿۸۶﴾﴾ ’’کیا تم لوگ اللہ کے سوا خود ساختہ معبودوں کو چاہتے ہو!‘‘

’’اِفک‘‘ کے معنی ہیں گھڑی ہوئی چیز‘ جس کی حقیقت کچھ نہ ہو۔ تُرِيْدُوْنَ کے الفاظ میں ان مَن گھڑت معبودوں کے لیے ان لوگوں کی چاہت اور محبت کی طرف اشارہ ہے۔ یعنی تم لوگ ان کے طالب ہو اور وہ تمہارے محبوب ومطلوب ہیں۔ سورۃ الحج میں ایسے طالب و مطلوب کی حیثیت اور اوقات کی حقیقت ان الفاظ میں بیان فرمائی گئی ہے: ﴿ضَعُفَ الطَّالِبُ

وَالْمَطْلُوْبُ ﴿۷۳﴾ ’’کس قدر کمزور ہے طالب بھی اور مطلوب بھی!‘‘

آیت ۸۷ ﴿فَمَا ظَنُّكُمْ بِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۸۷﴾﴾ ’’تو تمہارا کیا گمان ہے ربّ العالمین کے بارے میں؟‘‘

اس ہستی کے بارے میں تمہارا کیا گمان ہے جو تمام جہانوں کا پروردگار اور مالک ہے؟‘‘

آیت ۸۸ ﴿فَنَظَرَ نَظْرَةً فِي النُّجُوْمِ ﴿۸۸﴾﴾ ’’پس اُس نے ایک نظر ستاروں پر ڈالی۔‘‘

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ستاروں پر نگاہ ڈال کر گویا یہ تاثر دیا کہ وہ ستارہ شناسی کی مدد سے کچھ معلوم کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔

آیت ۸۹ ﴿فَقَالَ اِنِّيْ سَقِيْمٌ ﴿۸۹﴾﴾ ’’پھر کہا کہ میں تو بیمار ہوں۔‘‘

میری طبیعت کچھ ٹھیک نہیں ہے‘ یا یہ کہ میں بیمار ہونے والا ہوں۔ مجھے خدشہ ہے کہ مجھ پر بیماری آنے والی ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی قوم میں بُت پرستی بھی عام تھی اور ستارہ پرستی بھی۔ ان کے ہاں ہندوؤں کے جنم اشٹمی کے میلے کی طرز پر سالانہ ایک جشن منایا جاتا تھا۔ اس موقع پر شہر کے تمام لوگ باہر کھلے میدان میں جا کر کسی ستارے کی پرستش کیا کرتے تھے۔ چنانچہ جب جشن کا دن آیا تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کہا کہ میری تو طبیعت خراب ہے‘ میں آپ لوگوں کے ساتھ نہیں جا سکتا۔ اس طرح آپؑ پیچھے رہ گئے۔

آیت ۹۰ ﴿فَتَوَلَّوْا عَنْهُ مُدْبِرِيْنَ ﴿۹۰﴾﴾ ’’تو وہ اس سے پھر گئے پیٹھ پھیرتے ہوئے۔‘‘

یعنی حضرت ابراہیم علیہ السلام کو چھوڑ کر وہ لوگ اپنی پوجا پاٹ کے لیے چلے گئے۔

آیت ۹۱ ﴿فَرَاغَ اِلٰٓى اٰلِهَتِهِمْ فَقَالَ اَلَا تَاْكُلُوْنَ ﴿۹۱﴾﴾ ’’پھر وہ چپکے سے ان کے معبودوں میں جا گھسا اور کہنے لگا کہ تم کھاتے کیوں نہیں؟‘‘

لوگوں کے چلے جانے کے بعد حضرت ابراہیم علیہ السلام ان کے مندر میں گھس گئے۔ جشن کے مخصوص موقع کے حوالے سے نذرانوں کے طور پر بُتوں کے سامنے لازماً انواع و اقسام کے کھانے سجائے گئے ہوں گے۔ چنانچہ یہ منظر دیکھ کر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ان سے سوال کیا کہ آخر کیا وجہ ہے کہ مزے مزے کے کھانے تمہارے سامنے پڑے ہیں مگر آپ لوگ تناول نہیں فرما رہے؟

آیت ۹۲ ﴿مَا لَكُمْ لَا تَنْطِقُوْنَ ﴿۹۲﴾﴾ ’’تمہیں کیا ہو گیا ہے‘ تم بولتے بھی نہیں ہو!‘‘

آیت ۹۳ ﴿فَرَاغَ عَلَيْهِمْ ضَرْبًۢا بِالْيَمِيْنِ ﴿۹۳﴾﴾ ’’پھر وہ پِل پڑا ان پر ضرب لگاتا ہوا

داہنے ہاتھ سے۔‘‘

یعنی پھر آپؑ نے پوری قوت سے ان پر تیشے وغیرہ کے وار کرنے شروع کر دیے۔

آیت ۹۴ ﴿فَاَقْبَلُوْٓا اِلَيْهِ يَزِفُّوْنَ ﴿۹۴﴾﴾ ’’تو وہ اُس کی طرف آئے‘ دوڑتے ہوئے۔‘‘

اس واقعہ کے بارے میں کچھ تفصیل سورۃ الانبیاء کے پانچویں رکوع میں بھی ہم پڑھ چکے ہیں۔ یہاں پر باقی تفصیل چھوڑ دی گئی ہے کہ آپؑ نے تمام بتوں کو توڑ پھوڑ کر چورا کر دیا‘ سوائے ایک بڑے بُت کے۔ صورتِ حال انتہائی نازک اور تشویشناک تھی اور اس غیر معمولی واقعہ کے بعد شہر میں تو گویا قیامت برپا ہو گئی ہو گی۔ لیکن جب قوم کے بہت سے لوگ غیظ و غضب اور اشتعال کی کیفیت میں بھاگم بھاگ آپؑ تک پہنچے تو آپؑ نے نہ صرف بلا خوف ان کا سامنا کیا بلکہ ان کے ساتھ مدلّل مناظرہ بھی کیا:

آیت ۹۵ ﴿قَالَ اَتَعْبُدُوْنَ مَا تَنْحِتُوْنَ ﴿۹۵﴾﴾ ’’اُس نے کہا: کیا تم انہیں پوجتے ہو جنہیں تم خود تراشتے ہو!‘‘

آیت ۹۶ ﴿وَاللّٰهُ خَلَقَكُمْ وَمَا تَعْمَلُوْنَ ﴿۹۶﴾﴾ ’’جبکہ اللہ نے پیدا کیا ہے تمہیں بھی اور جو کچھ تم بناتے ہو (اس کو بھی)۔‘‘

یہ آیت حکمت اور فلسفۂ قرآنی کے اعتبار سے بہت اہم ہے۔ اس حوالے سے اہل سنت کا عقیدہ ہے کہ انسان ’’کاسبِ عمل‘‘ تو ہے مگر ’’خالقِ عمل‘‘ نہیں ہے۔ مثلاً میں ارادہ کرتا ہوں کہ اپنے سامنے پڑا ہوا پیالہ اٹھاؤں۔ اس میں ارادے کی حد تک تو مجھے اختیار ہے مگر اللہ کے اِذن کے بغیر اس پیالے کو اٹھانا میرے بس کی بات نہیں ہے۔ اس میں بہت سے دوسرے عوامل بھی کارفرما ہو سکتے ہیں۔ میرے اٹھانے سے پہلے اس پیالے پر کوئی دوسری قوت بھی اثر انداز ہو سکتی ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ کسی وجہ سے میرا دماغ میرے ارادے یا فیصلے کو میرے ہاتھوں تک پہنچا بھی نہ پائے۔ بہر حال انسان کا عمل دخل اس حوالے سے صرف ارادے تک محدود ہے اور اسی ارادے کے مطابق ہی وہ سزا یا جزا کا مستحق قرار پاتا ہے۔ مگر یہ بات طے ہے کہ اللہ کے اذن کے بغیر کوئی واقعہ یا کوئی عمل وقوع پذیر نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ آیت زیر مطالعہ کے الفاظ میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی زبان سے ان لوگوں کو خاص طور پر بتایا گیا کہ تم نے ان بتوں کو اپنے ہاتھوں سے تراشا ہے نا! لیکن تم لوگوں کو معلوم ہونا چاہیے کہ جو کچھ تم اپنے ہاتھوں سے کرتے ہو‘ اور تمہارے جو بھی اَعمال و اَفعال ہیں ان کا خالق بھی اللہ تعالیٰ ہے۔

آیت ۹۷ ﴿قَالُوا ابْنُوْا لَهٗ بُنْيَانًا فَاَلْقُوْهُ فِي الْجَحِيْمِ ﴿۹۷﴾﴾ ''انہوں نے کہا کہ اس کے لیے ایک عمارت بناؤ' پھر اس کو شعلے مارتی ہوئی آگ میں جھونک دو۔''

آیت ۹۸ ﴿فَاَرَادُوْا بِهٖ كَيْدًا فَجَعَلْنٰهُمُ الْاَسْفَلِيْنَ ﴿۹۸﴾﴾ ''تو اس طرح انہوں نے اس کے ساتھ ایک داؤ آزمایا' لیکن ہم نے ان کو ہی نیچا دکھا دیا۔''

انہوں نے ابراہیم علیہ السلام کے خلاف کون سا داؤ آزمایا تھا' اس کی وضاحت قبل ازیں سورۃ الانبیاء کی آیت ۷۰ کی تشریح کے ضمن میں ہو چکی ہے۔ دراصل وہ لوگ آپؑ کو آگ میں جلانا نہیں چاہتے تھے بلکہ محض ڈرانا چاہتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ جب آپؑ دیکھیں گے کہ ان کے لیے آگ کا اتنا بڑا الاؤ دہکایا جا رہا ہے تو سارا نشہ ہرن ہو جائے گا' اور پھر جب انہیں آگ کے دہانے پر لا کر کھڑا کیا جائے گا تو ہوش ٹھکانے آ جائیں گے اور آپؑ تائب ہو کر اپنے عقائد سے رجوع کر لیں گے۔ ان کا خیال تھا کہ اس طرح یہ ''فتنہ'' دب جائے گا۔ لیکن یہاں تو معاملہ بالکل ہی الٹ ہو گیا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو الاؤ کے دہانے پر لایا گیا تو بقول اقبالؔ ؎

بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق عقل ہے محوِ تماشائے لبِ بام ابھی!

بہر حال جب ابراہیم علیہ السلام نے بھرپور استقامت کا مظاہرہ کیا تو پھر اللہ تعالیٰ نے آپؑ کے لیے آگ کو گل و گلزار بنا دیا۔ اس طرح وہ لوگ اپنے ارادوں اور منصوبوں سمیت خائب و خاسر ہو گئے۔

آیت ۹۹ ﴿وَقَالَ اِنِّيْ ذَاهِبٌ اِلٰى رَبِّيْ سَيَهْدِيْنِ ﴿۹۹﴾﴾ ''اور اب اُس نے کہا کہ میں اپنے رب کی طرف جانے والا ہوں' وہ ضرور میری راہنمائی کرے گا۔''

یہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ہجرت کی طرف اشارہ ہے۔ اللہ تعالیٰ کا قانون ہے کہ جب کوئی قوم اپنے نبی یا رسول کے قتل پر آمادہ ہو جائے تو پھر وہ نبی یا رسول مزید اس قوم کے درمیان نہیں رہتے۔ آپؑ کی قوم نے تو آپؑ کے قتل کی صرف منصوبہ بندی ہی نہیں کی تھی بلکہ آپؑ کو بالفعل آگ میں ڈال دیا تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ اللہ نے آپؑ کو معجزانہ طور پر بچا لیا۔ اسی طرح یہودیوں نے بھی اپنے طور پر حضرت مسیح علیہ السلام کو سولی پر چڑھا دیا تھا مگر اللہ تعالیٰ نے ان کی تدبیر کو ناکام بنایا اور آپؑ کو اپنی طرف اٹھا لیا۔ اسی طرح مشرکینِ مکّہ نے بھی جب محمدؐ رسول اللہ ﷺ کے قتل کا ارادہ کیا اور آپؐ کو قتل کرنے کے لیے جمع ہو گئے تو اللہ تعالیٰ نے ان کی آنکھوں میں دھول جھونکتے ہوئے اپنے پیغمبر ﷺ کو مدینہ منورہ پہنچا دیا۔

چنانچہ اللہ تعالیٰ کے اس قانون کے تحت حضرت ابراہیم علیہ السلام نے عراق سے ہجرت کا ارادہ فرمایا۔ اس وقت تک آپؑ کو شاید ہجرت کی منزل کے بارے میں معلوم نہیں تھا' اس لیے آپؑ نے فرمایا کہ میرا پروردگار خود میری راہنمائی فرمائے گا کہ مجھے کدھر جانا ہے۔ چنانچہ آپؑ نے عراق سے فلسطین کی طرف ہجرت کی' جس کے لیے آپؑ کو بہت لمبا راستہ اختیار کرنا پڑا۔ عراق' شام اور فلسطین کے درمیان شرقِ اردن کا پورا علاقہ لق و دق صحرا پر مشتمل ہے' جسے عبور کرنا بالکل ناممکن تھا۔ چنانچہ آپؑ دریائے فرات کے ساتھ ساتھ سفر کرتے ہوئے اوپر شام کے شمالی علاقے ''باران'' پہنچے اور وہاں سے نیچے فلسطین کے علاقے میں داخل ہوئے۔

آیت ۱۰۰ ﴿رَبِّ هَبْ لِيْ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿۱۰۰﴾﴾ ''(آپؑ نے دعا کی:) پروردگار! مجھے ایک صالح بیٹا عطا فرما۔''

آیت ۱۰۱ ﴿فَبَشَّرْنٰهُ بِغُلٰمٍ حَلِيْمٍ ﴿۱۰۱﴾﴾ ''تو ہم نے اُسے بشارت دی ایک حلیم الطبع لڑکے کی۔''

اس سے حضرت اسماعیل علیہ السلام مراد ہیں ـــــ ''حلیم'' اللہ تعالیٰ کا صفاتی نام ہے اور اس حوالے سے قرآن میں یہ لفظ بار بار آیا ہے۔ ویسے تو اللہ کی صفات کا کچھ نہ کچھ عکس انسانوں کے اندر بھی پایا جاتا ہے لیکن ''حِلم'' اللہ کی وہ شان ہے جو انسانوں میں زیادہ عام نہیں ہے۔ لفظ ''حلیم'' غیر اللہ کے لیے قرآن میں صرف تین مرتبہ آیا ہے۔ دو مرتبہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے لیے (التوبہ: ۱۱۴ اور ہود: ۷۵) اور ایک مرتبہ حضرت اسماعیل علیہ السلام کے لیے آیت زیر مطالعہ میں۔ یہاں ایک قابل توجہ نکتہ یہ بھی ہے کہ اس آیت میں حضرت اسماعیل علیہ السلام کو غُلٰمٍ حَلِيْمٍ جبکہ حضرت اسحاق علیہ السلام کو سورۃ الحجر کی آیت ۵۳ میں غُلٰمٍ عَلِيْمٍ کے لقب سے نوازا گیا ہے۔ یعنی ایک بھائی علم میں زیادہ تھے اور ان ہی سے آگے بنی اسرائیل میں نبوت کا سلسلہ چلا اور دوسرے بھائی یعنی حضرت اسماعیلؑ ''حلم'' میں زیادہ تھے اور ان کی اولاد میں نبی آخر الزماں حضرت محمد ﷺ کی بعثت ہوئی۔

آیت ۱۰۲ ﴿فَلَمَّا بَلَغَ مَعَهُ السَّعْيَ﴾ ''پھر جب وہ پہنچا اس کے ساتھ بھاگ دوڑ کرنے کی عمر کو''

﴿قَالَ يٰبُنَيَّ اِنِّيْٓ اَرٰى فِي الْمَنَامِ اَنِّيْٓ اَذْبَحُكَ﴾ ''اُس نے کہا: اے میرے بیٹے! میں دیکھ رہا ہوں خواب میں کہ میں تمہیں ذبح کر رہا ہوں''

اَرٰی فعل مضارع ہے جس میں استمرار کے معنی بھی پائے جاتے ہیں‘ یعنی میں بار بار خواب میں یہ منظر دیکھ رہا ہوں۔ بعض روایات میں ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے مسلسل تین راتیں یہ خواب دیکھا تھا۔

﴿فَانْظُرْ مَاذَا تَرٰی ؕ﴾ ’’تو دیکھو! تمہاری کیا رائے ہے؟‘‘

﴿قَالَ یٰۤاَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ ۫﴾ ’’اُس نے کہا: ابا جان! آپ کر گزریئے جس کا آپ کو حکم ہو رہا ہے۔‘‘

یہ جواب حضرت اسماعیل علیہ السلام کے ’’حلم‘‘ کی عکاسی کرتا ہے اور آپؑ کی اسی طبیعت کی وجہ سے آپؑ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ’’حلیم‘‘ کا خطاب ملا ہے۔ آپؑ جانتے تھے کہ میرے والد نبی ہیں اور ان کا خواب کسی شیطانی وسوسے کا نتیجہ نہیں بلکہ وحی کا حصہ ہے۔ اس لیے آپؑ نے یہ نہیں کہا کہ یہ تو خواب ہے اور خواب کا کیا ہے‘ یا یہ کہ آپؑ کوئی قدم اٹھانے سے پہلے اچھی طرح سوچ سمجھ لیجیے‘ بلکہ آپؑ نے بغیر کسی تردد اور حیل وحجت کے اس ’’حکم‘‘ کے آگے سرِ تسلیم خم کرتے ہوئے اپنے والد محترم کو اس پر عمل کرنے کا مشورہ دیا‘ اور آپؑ کو یقین دلایا کہ:

﴿سَتَجِدُنِیْۤ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ مِنَ الصّٰبِرِیْنَ ﴿۱۰۲﴾﴾ ’’اللہ نے چاہا تو آپ مجھے صبر کرنے والوں میں پائیں گے۔‘‘

یہاں پر ایک بات یہ بھی نوٹ کر لیجیے کہ یہودیوں نے حضرت اسماعیل علیہ السلام کے بجائے حضرت اسحاق علیہ السلام کو ’’ذبیح اللہ‘‘ ثابت کرنے کی بہت کوشش کی ہے۔ اس کے لیے انہوں نے تورات میں جا بجا تحریف بھی کی ہے اور مختلف جگہوں کے نام بھی بدل ڈالے ہیں۔ مثلاً ’’مروہ‘‘ کی قربان گاہ کے مقابلے میں انہوں نے فلسطین میں ایک جگہ کا نام ’’موریاہ‘‘ رکھ دیا اور وہیں پر ایک وادی کو ’’وادیٔ مکا‘‘ کے نام سے موسوم کر دیا‘ تاکہ کسی طرح یہ ثابت کیا جا سکے کہ ’’قربانی‘‘ کا یہ واقعہ حضرت اسماعیلؑ کے ساتھ وادیٔ مکہ میں پیش نہیں آیا تھا بلکہ فلسطین میں حضرت اسحاقؑ کے ساتھ پیش آیا تھا۔ ان کا یہ پروپیگنڈا اس قدر مؤثر ثابت ہوا کہ ہمارے ہاں کے کئی مفسّرین بھی اس مغالطے میں مبتلا ہو گئے کہ ذبیح اللہ حضرت اسماعیلؑ نہیں بلکہ حضرت اسحاقؑ تھے۔ مثلاً ابن جریر طبری ایک بہت بڑے مفسر ہونے کے باوجود ان اسرائیلی روایات سے متاثر ہیں۔ چنانچہ مولانا حمید الدین فراہیؒ نے اس موضوع پر ’’الرأی الصحیح فی من ھو الذبیح‘‘ کے عنوان سے ایک معرکۃ الآرا کتاب لکھی اور مدلّل انداز میں ثابت کیا کہ

ذبیح اللہ حضرت اسماعیل علیہ السلام ہی تھے۔ مولانا فراہیؒ کی اصل کتاب عربی میں ہے۔ مولانا امین احسن اصلاحی نے اس کا اردو ترجمہ کیا تھا‘ جسے ’’ذبیح کون؟‘‘ کے نام سے مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کے تحت شائع کیا گیا‘ مگر کتاب اس قدر دقیق ہے کہ ترجمے کے باوجود بھی اسے زیادہ پڑھنے والے دستیاب نہ ہو سکے۔

آیت ۱۰۳ ﴿فَلَمَّاۤ اَسْلَمَا وَتَلَّهٗ لِلْجَبِیْنِ ﴿۱۰۳﴾﴾ ’’پھر جب دونوں نے فرمانبرداری کی روش اختیار کر لی اور ابراہیم نے اس کو پیشانی کے بل لٹا دیا۔‘‘

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بیٹے کو ذبح کرنے کے لیے پیشانی کے بل لٹایا تاکہ چہرہ سامنے نہ ہو اور اسی حالت میں گُدّی پر چُھری چلانے کی کوشش کی۔

آیت ۱۰۴ ﴿وَنَادَیْنٰهُ اَنْ یّٰۤاِبْرٰهِیْمُ ﴿۱۰۴﴾﴾ ’’اور ہم نے اسے پکارا کہ اے ابراہیمؑ!‘‘

آیت ۱۰۵ ﴿قَدْ صَدَّقْتَ الرُّءْیَا ۚ اِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِی الْمُحْسِنِیْنَ ﴿۱۰۵﴾﴾ ’’تم نے خواب سچ کر دکھایا‘ یقیناً ہم اسی طرح بدلہ دیتے ہیں محسنین کو۔‘‘

آیت ۱۰۶ ﴿اِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْبَلٰٓؤُا الْمُبِیْنُ ﴿۱۰۶﴾﴾ ’’یقیناً یہ بہت بڑی آزمائش تھی۔‘‘

گویا ممتحن خود کہہ رہا ہے کہ میں نے جو امتحان لیا وہ بہت سخت تھا۔ یہ تحسین اور شاباش کی انتہا ہے۔ میں نے اس موضوع پر ’’حج اور عید الاضحیٰ اور ان کی اصل روح: قرآن حکیم کے آئینے میں‘‘ کے عنوان سے ایک تحریر لکھی تھی جو میرے کتابچے ’’عید الاضحیٰ اور فلسفۂ قربانی‘‘ میں شامل ہے۔

آیت ۱۰۷ ﴿وَفَدَیْنٰهُ بِذِبْحٍ عَظِیْمٍ ﴿۱۰۷﴾﴾ ’’اور ہم نے ایک ذبح عظیم اس کا فدیہ دیا۔‘‘

اللہ کے حکم سے جنت سے ایک مینڈھا لایا گیا جو حضرت اسماعیل علیہ السلام کی جگہ ذبح ہوا۔ مسلمانوں کے ہاں عید الاضحیٰ کے موقع پر ہر سال جانوروں کی قربانی پیش کر کے اسی قربانی کی یاد منائی جاتی ہے۔

آیت ۱۰۸ ﴿وَتَرَكْنَا عَلَیْهِ فِی الْاٰخِرِیْنَ ﴿۱۰۸﴾﴾ ’’اور اسی (کے طریقے) پر ہم نے باقی رکھا بعد میں آنے والوں میں سے بھی (کچھ لوگوں کو)۔‘‘

اس سے پوری ملت ابراہیمؑ بھی مراد ہو سکتی ہے۔ جیسے قبل ازیں آیت ۷۸ میں حضرت نوح علیہ السلام کے بارے میں بھی فرمایا گیا کہ ان کی ملت پر بعد میں ہم نے کچھ لوگوں کو قائم رکھا‘ جن میں خود ابراہیم علیہ السلام بھی شامل تھے۔ اس کے علاوہ آیت کا مفہوم یہ بھی ہو سکتا ہے کہ قربانی کی اس سنت کو اللہ تعالیٰ نے بعد میں آنے والے لوگوں میں زندہ اور قائم رکھا۔ اس کا ایک

مفہوم یہ بھی لیا گیا ہے کہ ہم نے بعد میں آنے والوں میں اس کا ذکرِ خیر باقی رکھا۔

آیت ۱۰۹ ﴿سَلٰمٌ عَلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ ﴿۱۰۹﴾﴾ ''سلام ہو ابراہیمؑ پر۔''

آیت ۱۱۰ ﴿كَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۱۱۰﴾﴾ ''اسی طرح ہم بدلہ دیتے ہیں محسنین کو۔''

آیت ۱۱۱ ﴿اِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۱۱﴾﴾ ''یقیناً وہ ہمارے مؤمن بندوں میں سے تھا۔''

آیت ۱۱۲ ﴿وَبَشَّرْنٰهُ بِاِسْحٰقَ نَبِيًّا مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿۱۱۲﴾﴾ ''اور ہم نے اسے بشارت دی اسحاقؑ کی' ایک نبی صالحین میں سے۔''

اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام سے اکلوتے بیٹے حضرت اسماعیل علیہ السلام کی قربانی کا جو امتحان لیا' اس میں کامیابی کے انعام کے طور پر آپؑ کو دوسرے بیٹے حضرت اسحاق علیہ السلام کی ولادت کی خوشخبری دی گئی۔

آیت ۱۱۳ ﴿وَبٰرَكْنَا عَلَيْهِ وَعَلٰٓى اِسْحٰقَ ۭ﴾ ''اور ہم نے برکت نازل کی اُس پر بھی اور اسحاقؑ پر بھی۔''

﴿وَمِنْ ذُرِّيَّتِهِمَا مُحْسِنٌ وَّظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ مُبِيْنٌ ﴿۱۱۳﴾﴾ ''اور ان دونوں کی اولاد میں سے نیکوکار بھی تھے اور اپنی جانوں پر صریح ظلم کرنے والے بھی۔''

''ان دونوں'' سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دونوں بیٹے حضرت اسماعیل اور حضرت اسحاق علیہما السلام مراد ہیں۔

حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل علیہما السلام کا یہ واقعہ قصص النبیینؐ کے انداز میں بیان ہوا ہے۔ قصص النبیین اور انباء الرسل کی اصطلاحات قرآن کے اس مطالعہ کے دوران قبل ازیں متعدد بار زیر بحث آ چکی ہیں۔

آیات ۱۱۴ تا ۱۴۸

وَلَقَدْ مَنَنَّا عَلٰي مُوْسٰى وَهٰرُوْنَ ﴿۱۱۴﴾ وَنَجَّيْنٰهُمَا وَقَوْمَهُمَا مِنَ الْكَرْبِ
الْعَظِيْمِ ﴿۱۱۵﴾ وَنَصَرْنٰهُمْ فَكَانُوْا هُمُ الْغٰلِبِيْنَ ﴿۱۱۶﴾ وَاٰتَيْنٰهُمَا الْكِتٰبَ
الْمُسْتَبِيْنَ ﴿۱۱۷﴾ وَهَدَيْنٰهُمَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ﴿۱۱۸﴾ وَتَرَكْنَا عَلَيْهِمَا فِي
الْاٰخِرِيْنَ ﴿۱۱۹﴾ سَلٰمٌ عَلٰي مُوْسٰى وَهٰرُوْنَ ﴿۱۲۰﴾ اِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِي
الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۱۲۱﴾ اِنَّهُمَا مِنْ عِبَادِنَا الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۲۲﴾ وَاِنَّ اِلْيَاسَ لَمِنَ

الْمُرْسَلِيْنَ ﴿۱۲۳﴾ اِذْ قَالَ لِقَوْمِهٖٓ اَلَا تَتَّقُوْنَ ﴿۱۲۴﴾ اَتَدْعُوْنَ بَعْلًا وَّتَذَرُوْنَ اَحْسَنَ
الْخَالِقِيْنَ ﴿۱۲۵﴾ اللّٰهَ رَبَّكُمْ وَرَبَّ اٰبَآئِكُمُ الْاَوَّلِيْنَ ﴿۱۲۶﴾ فَكَذَّبُوْهُ فَاِنَّهُمْ لَمُحْضَرُوْنَ ﴿۱۲۷﴾
اِلَّا عِبَادَ اللّٰهِ الْمُخْلَصِيْنَ ﴿۱۲۸﴾ وَتَرَكْنَا عَلَيْهِ فِي الْاٰخِرِيْنَ ﴿۱۲۹﴾ سَلٰمٌ عَلٰٓى اِلْ
يَاسِيْنَ ﴿۱۳۰﴾ اِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۱۳۱﴾ اِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۳۲﴾ وَاِنَّ
لُوْطًا لَّمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ﴿۱۳۳﴾ اِذْ نَجَّيْنٰهُ وَاَهْلَهٗٓ اَجْمَعِيْنَ ﴿۱۳۴﴾ اِلَّا عَجُوْزًا فِي الْغٰبِرِيْنَ ﴿۱۳۵﴾
ثُمَّ دَمَّرْنَا الْاٰخَرِيْنَ ﴿۱۳۶﴾ وَاِنَّكُمْ لَتَمُرُّوْنَ عَلَيْهِمْ مُّصْبِحِيْنَ ﴿۱۳۷﴾ وَبِالَّيْلِ ۭ اَفَلَا
تَعْقِلُوْنَ ﴿۱۳۸﴾ وَاِنَّ يُوْنُسَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ﴿۱۳۹﴾ اِذْ اَبَقَ اِلَى الْفُلْكِ الْمَشْحُوْنِ ﴿۱۴۰﴾
فَسَاهَمَ فَكَانَ مِنَ الْمُدْحَضِيْنَ ﴿۱۴۱﴾ فَالْتَقَمَهُ الْحُوْتُ وَهُوَ مُلِيْمٌ ﴿۱۴۲﴾ فَلَوْلَآ اَنَّهٗ
كَانَ مِنَ الْمُسَبِّحِيْنَ ﴿۱۴۳﴾ لَلَبِثَ فِيْ بَطْنِهٖٓ اِلٰى يَوْمِ يُبْعَثُوْنَ ﴿۱۴۴﴾ فَنَبَذْنٰهُ بِالْعَرَآءِ
وَهُوَ سَقِيْمٌ ﴿۱۴۵﴾ وَاَنْۢبَتْنَا عَلَيْهِ شَجَرَةً مِّنْ يَّقْطِيْنٍ ﴿۱۴۶﴾ وَاَرْسَلْنٰهُ اِلٰى مِائَةِ اَلْفٍ
اَوْ يَزِيْدُوْنَ ﴿۱۴۷﴾ فَاٰمَنُوْا فَمَتَّعْنٰهُمْ اِلٰى حِيْنٍ ﴿۱۴۸﴾

آیت ۱۱۴ ﴿وَلَقَدْ مَنَنَّا عَلٰي مُوْسٰى وَهٰرُوْنَ ﴿۱۱۴﴾﴾ ''اور ہم نے موسیٰؑ اور ہارونؑ پر بھی احسان فرمایا۔''

آیت ۱۱۵ ﴿وَنَجَّيْنٰهُمَا وَقَوْمَهُمَا مِنَ الْكَرْبِ الْعَظِيْمِ ﴿۱۱۵﴾﴾ ''اور ہم نے نجات دی ان دونوں کو اور ان کی قوم کو ایک کربِ عظیم سے۔''

آیت ۱۱۶ ﴿وَنَصَرْنٰهُمْ فَكَانُوْا هُمُ الْغٰلِبِيْنَ ﴿۱۱۶﴾﴾ ''اور ہم نے ان کی مدد کی' پھر وہی غالب ہوئے۔''

اللہ کی مدد سے انہیں نجات ملی اور ان کا دشمن ان کے سامنے غرق ہوا۔

آیت ۱۱۷ ﴿وَاٰتَيْنٰهُمَا الْكِتٰبَ الْمُسْتَبِيْنَ ﴿۱۱۷﴾﴾ ''اور ہم نے ان دونوں کو ایک روشن کتاب دی۔''

یعنی تورات جس کی تعلیمات بہت واضح تھیں۔

آیت ۱۱۸ ﴿وَهَدَيْنٰهُمَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ﴿۱۱۹﴾﴾ ''اور ہم نے ان دونوں کو صراطِ مستقیم کی ہدایت دی۔''

آیت ۱۱۹ ﴿وَتَرَكْنَا عَلَيْهِمَا فِي الْاٰخِرِيْنَ ﴿۱۲۰﴾﴾ ''اور ان دونوں (کے طریقے) پر ہم

نے باقی رکھا بعد میں آنے والوں میں سے بھی (کچھ لوگوں کو)۔''

آیت ۱۲۰ ﴿سَلٰمٌ عَلٰٓی مُوْسٰی وَہٰرُوْنَ ﴿۱۲۰﴾﴾ ''سلام ہو موسیٰؑ پر اور ہارونؑ پر۔''

آیت ۱۲۱ ﴿اِنَّا کَذٰلِکَ نَجْزِی الْمُحْسِنِیْنَ ﴿۱۲۱﴾﴾ ''یقیناً ہم ایسا ہی بدلہ دیا کرتے ہیں محسنین کو۔''

آیت ۱۲۲ ﴿اِنَّہُمَا مِنْ عِبَادِنَا الْمُؤْمِنِیْنَ ﴿۱۲۲﴾﴾ ''یقیناً وہ دونوں ہمارے مؤمن بندوں میں سے تھے۔''

آیت ۱۲۳ ﴿وَاِنَّ اِلْیَاسَ لَمِنَ الْمُرْسَلِیْنَ ﴿۱۲۳﴾﴾ ''اور یقیناً الیاسؑ بھی رسولوں میں سے تھا۔''

حضرت الیاس علیہ السلام حضرت ہارون علیہ السلام کی نسل میں سے تھے۔ آپؑ بنی اسرائیل کے مشہور شہر ''بَعْلَبَک'' میں مبعوث ہوئے تھے۔ اس شہر میں سانڈھ کی شکل کا ایک بہت بڑا بت بنایا گیا تھا جس کا نام آگے آیت ۱۲۵ میں ''بعل'' بتایا گیا ہے۔ اسی بُت کے نام پر اس شہر کا نام ''بعلبک'' (بعل کا بک) رکھا گیا تھا یعنی بعل کا شہر۔ پرانی عبرانی زبان میں شہر کو بک یا بکہ کہا جاتا تھا۔ (چنانچہ مکہ کا پرانا نام بھی بَکّہ تھا' جس کا حوالہ سورۂ آل عمران کی آیت ۹۶ میں آیا ہے۔) بہرحال اس قوم کے لوگوں نے اس شہر کو اپنے معبود کے نام سے منسوب کر رکھا تھا۔

آیت ۱۲۴ ﴿اِذْ قَالَ لِقَوْمِہٖٓ اَلَا تَتَّقُوْنَ ﴿۱۲۴﴾﴾ ''جب اُس نے اپنی قوم سے کہا: کیا تم تقویٰ اختیار نہیں کرتے؟''

آیت ۱۲۵ ﴿اَتَدْعُوْنَ بَعْلًا وَّتَذَرُوْنَ اَحْسَنَ الْخَالِقِیْنَ ﴿۱۲۵﴾﴾ ''کیا تم بعل کو پکارتے ہو اور بہترین خالق کو چھوڑتے ہو!''

آیت ۱۲۶ ﴿اَللّٰہَ رَبَّکُمْ وَرَبَّ اٰبَآئِکُمُ الْاَوَّلِیْنَ ﴿۱۲۶﴾﴾ ''یعنی اللہ جو تمہارا رب ہے اور تمہارے پہلے آباء و اَجداد کا بھی رب ہے۔''

آیت ۱۲۷ ﴿فَکَذَّبُوْہُ فَاِنَّہُمْ لَمُحْضَرُوْنَ ﴿۱۲۷﴾﴾ ''تو انہوں نے اس کو جھٹلا دیا' چنانچہ وہ سب (قیامت کے دن) حاضر کر لیے جائیں گے۔''

آیت ۱۲۸ ﴿اِلَّا عِبَادَ اللّٰہِ الْمُخْلَصِیْنَ ﴿۱۲۸﴾﴾ ''سوائے اللہ کے ان بندوں کے جنہیں

خالص کر لیا گیا۔''

آیت ۱۲۹ ﴿وَتَرَکْنَا عَلَیْہِ فِی الْاٰخِرِیْنَ ﴿۱۲۹﴾﴾ ''اور اسی (کے طریقے) پر ہم نے باقی رکھا بعد میں آنے والوں میں سے بھی (کچھ لوگوں کو)۔''

یعنی یہ تمام انبیاء و رسل علیہم السلام ایک ہی ملت کے افراد تھے اور اسی ملّت اور اسی طریقے کا تسلسل ہے جو ہدایت کی صورت میں نسل انسانی میں چلا آ رہا ہے۔ چنانچہ یہی بات سورۃ الانبیاء کی آیت ۹۲ اور سورۃ المؤمنون کی آیت ۵۲ میں اس طرح بیان ہوئی ہے: ﴿وَاِنَّ ہٰذِہٖٓ اُمَّتُکُمْ اُمَّۃً وَّاحِدَۃً﴾ ''اور یقیناً یہ تمہاری امت ایک ہی امت ہے۔''

آیت ۱۳۰ ﴿سَلٰمٌ عَلٰٓی اِلْ یَاسِیْنَ ﴿۱۳۰﴾﴾ ''سلام ہو الیاسؑ پر۔''

آیت ۱۳۱ ﴿اِنَّا کَذٰلِکَ نَجْزِی الْمُحْسِنِیْنَ ﴿۱۳۱﴾﴾ ''یقیناً ہم اسی طرح بدلہ دیا کرتے ہیں محسنین کو۔''

آیت ۱۳۲ ﴿اِنَّہٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُؤْمِنِیْنَ ﴿۱۳۲﴾﴾ ''یقیناً وہ ہمارے مؤمن بندوں میں سے تھا۔''

آیت ۱۳۳ ﴿وَاِنَّ لُوْطًا لَّمِنَ الْمُرْسَلِیْنَ ﴿۱۳۳﴾﴾ ''اور یقیناً لوطؑ بھی رسولوں میں سے تھا۔''

آیت ۱۳۴ ﴿اِذْ نَجَّیْنٰہُ وَاَہْلَہٗٓ اَجْمَعِیْنَ ﴿۱۳۴﴾﴾ ''جب ہم نے نجات دی اُس کو اور اس کے گھر والوں کو' سب کو۔''

اگرچہ تورات کے مطابق آپؑ صرف اپنی دو بیٹیوں کو اپنے ساتھ لے کر نکلے تھے' یعنی ان کے علاوہ اس قوم میں کوئی اور اہل ایمان نہیں تھے' لیکن یہاں پر اَہْلَہٗٓ اَجْمَعِیْنَ (سب گھر والوں کو) کے الفاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ آپؑ کا گھرانہ خاصا بڑا ہوگا' جس میں سے آپؑ کی صرف ایک بیوی پیچھے رہ گئی تھی۔ (واللہ اعلم!)

آیت ۱۳۵ ﴿اِلَّا عَجُوْزًا فِی الْغٰبِرِیْنَ ﴿۱۳۵﴾﴾ ''سوائے ایک بڑھیا کے جو پیچھے رہ جانے والوں میں تھی۔''

آیت ۱۳۶ ﴿ثُمَّ دَمَّرْنَا الْاٰخَرِیْنَ ﴿۱۳۶﴾﴾ ''پھر ہم نے جڑ سے اکھاڑ کر پٹخ دیا باقیوں کو۔''

آیت ۱۳۷' ۱۳۸ ﴿وَاِنَّکُمْ لَتَمُرُّوْنَ عَلَیْہِمْ مُّصْبِحِیْنَ ﴿۱۳۷﴾ وَبِالَّیْلِ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿۱۳۸﴾﴾ ''اور تم لوگ گزرتے ہو ان (کے کھنڈرات) پر صبح کے وقت بھی اور رات

کو بھی، تو کیا تم عقل سے کام نہیں لیتے؟''

قومِ لوطؑ کی تباہ ہونے والی بستیوں میں سے سدوم اور عامورہ کے شہر معروف تھے۔ حال ہی میں برطانیہ سے تعلق رکھنے والے آرکیالوجی کے کچھ ماہرین کی تحقیق کے نتیجے میں ان شہروں کے کھنڈرات اور آثار بحرِ مُردار کے پانی کے نیچے دریافت ہوئے ہیں، جس سے تورات اور قرآن میں مذکور تفصیلات کی تصدیق ہوگئی ہے۔ اسی طرح جب اللہ کو منظور ہوگا حضرت نوح علیہ السلام کی کشتی بھی دنیا کی نگاہوں کے سامنے آجائے گی۔ سورۃ القمر آیت ۱۵ میں اس حوالے سے اشارہ موجود ہے کہ کسی وقت یہ کشتی ایک بڑی نشانی کے طور پر ظاہر ہوگی۔ ہمارا ایمان ہے کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ قرآن کی بیان کردہ تاریخ کے ثبوت ایک ایک کر کے دنیا کے سامنے آتے چلے جائیں گے۔ ان شاء اللہ!

آیت ۱۳۹ ﴿وَاِنَّ یُوْنُسَ لَمِنَ الْمُرْسَلِیْنَ ﴿۱۳۹﴾﴾ ''اور یقیناً یونسؑ بھی رسولوں میں سے تھا۔''

آیت ۱۴۰ ﴿اِذْ اَبَقَ اِلَی الْفُلْكِ الْمَشْحُوْنِ ﴿۱۴۰﴾﴾ ''جب وہ بھاگ کر پہنچا اُس کشتی کی طرف جو (پہلے سے ہی) بھری ہوئی تھی۔''

لفظ ''اَبَقَ'' کسی غلام کا اپنے آقا کے ہاں سے بھاگ جانے پر بولا جاتا ہے۔ اس واقعے کا ذکر سورۂ یونس اور سورۃ الانبیاء میں بھی آچکا ہے۔ حضرت یونس علیہ السلام کی قوم نے آپؑ کو جھٹلا دیا اور ان کے مسلسل انکار اور کفر کے باعث اللہ تعالیٰ نے اس قوم کو تباہ کرنے کا فیصلہ فرما لیا۔ اس سلسلے میں اللہ تعالیٰ کا قانون اور طریقہ یہی رہا ہے کہ کسی قوم پر عذاب سے قبل رسول کو وہاں سے نکل جانے کا حکم دیا جاتا اور رسول کے ہجرت کر جانے کے بعد متعلقہ قوم کو نیست و نابود کر دیا جاتا۔ حضرت یونس علیہ السلام سے اس ضمن میں یہ لغزش ہوگئی کہ آپؑ حمیتِ حق کے جوش میں غضبناک ہو کر (سورۃ الانبیاء کی آیت ۸۷ میں اس حوالے سے ﴿اِذْ ذَّهَبَ مُغَاضِبًا﴾ کے الفاظ آئے ہیں) اللہ تعالیٰ کی طرف سے واضح اجازت ملنے سے قبل ہی اپنی قوم کو چھوڑ کر نکل آئے اور دجلہ یا فرات میں سے کسی دریا کو پار کرنے کے لیے کشتی پر سوار ہو گئے۔

آیت ۱۴۱ ﴿فَسَاهَمَ فَكَانَ مِنَ الْمُدْحَضِیْنَ ﴿۱۴۱﴾﴾ ''تو انہوں نے قرعہ ڈالا، تو وہ ہو گیا دھکیل دیے جانے والوں میں سے۔''

پچھلی آیت میں مذکور ہے کہ وہ کشتی پہلے ہی گنجائش سے زیادہ بھری ہوئی تھی، چنانچہ جب

بیچ دریا میں جا کر کشتی ڈولنے لگی اور اس کے ڈوب جانے کا خطرہ پیدا ہو گیا تو بوجھ کم کرنے کی غرض سے کسی ایک مسافر کو دریا میں پھینکنے کے لیے یہ قرعہ اندازی کی گئی ہوگی۔ اس حوالے سے ایک روایت یہ بھی ہے کہ کشتی والوں نے یہ گمان کیا کہ کسی کا کوئی بھاگا ہوا غلام کشتی میں سوار ہے جس کی وجہ سے یہ ڈوبنے لگی ہے۔ چنانچہ اس مفرور غلام کا پتا لگانے کے لیے قرعہ اندازی کی گئی۔ بہرحال قرعہ اندازی میں حضرت یونس علیہ السلام کا نام نکلا اور آپؑ کو دریا میں پھینک دیا گیا۔

آیت ۱۴۲ ﴿فَالْتَقَمَهُ الْحُوْتُ وَهُوَ مُلِیْمٌ ﴿۱۴۲﴾﴾ ''تو اُس کو نگل لیا مچھلی نے اور وہ ملامت زدہ تھا۔''

یہ کوئی بہت بڑی وہیل مچھلی ہوگی۔ آج تو ہم مچھلیوں کی بہت سی ایسی اقسام کو بخوبی جانتے ہیں جو بڑی آسانی سے ایک ہی لقمے میں انسان کو نگل سکتی ہیں۔ وَهُوَ مُلِیْمٌ کے الفاظ میں ناراضگی اور خفگی کا انداز پایا جاتا ہے۔ اس حوالے سے اللہ کے ہاں ع ''جن کے رتبے ہیں سوا، ان کی سوا مشکل ہے'' کے مصداق کسی بہت بڑی شخصیت کی چھوٹی سی غلطی پر بھی بہت سخت گرفت ہوتی ہے۔

آیت ۱۴۳ ﴿فَلَوْلَاۤ اَنَّهٗ كَانَ مِنَ الْمُسَبِّحِیْنَ ﴿۱۴۳﴾﴾ ''تو اگر وہ تسبیح کرنے والوں میں سے نہ ہوتا۔''

سورۃ الانبیاء کی آیت ۸۷ میں ہم پڑھ چکے ہیں کہ حضرت یونس علیہ السلام اللہ تعالیٰ کی مشیت سے مچھلی کے پیٹ میں نہ صرف زندہ رہے بلکہ ان الفاظ سے تسبیح بھی کرتے رہے کہ: ﴿لَّاۤ اِلٰهَ اِلَّاۤ اَنْتَ سُبْحٰنَكَ ۖ اِنِّیْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِیْنَ ﴿۸۷﴾﴾ ''تیرے سوا کوئی معبود نہیں، تُو پاک ہے، اور یقیناً میں ہی ظالموں میں سے ہوں۔''

آیت ۱۴۴ ﴿لَلَبِثَ فِیْ بَطْنِهٖۤ اِلٰی یَوْمِ یُبْعَثُوْنَ ﴿۱۴۴﴾﴾ ''تو اُس کے پیٹ ہی میں رہتا اُس دن تک کہ جس میں لوگ اُٹھائے جائیں گے۔''

یعنی اگر آپؑ اللہ تعالیٰ کی تسبیح (آیتِ کریمہ کا ورد) نہ کرتے تو قیامت تک اس مچھلی کے پیٹ ہی میں رہتے (اُس کا پیٹ ہی آپؑ کے لیے قبر بنا رہتا) اور قیامت کے دن وہیں سے آپؑ اٹھائے جاتے۔

آیت ۱۴۵ ﴿فَنَبَذْنٰهُ بِالْعَرَآءِ وَهُوَ سَقِیْمٌ ﴿۱۴۵﴾﴾ ''تو ہم نے ڈال دیا اسے ایک چٹیل میدان میں اور وہ خستہ حالت میں تھا۔''

اس تسبیح اور استغفار (آیت کریمہ کے ورد) کی برکت سے اللہ تعالیٰ نے آپؑ کو اس مصیبت سے نجات دی اور اللہ کے حکم سے مچھلی نے آپؑ کو ساحل پر اُگل دیا۔ لیکن مچھلی کے معدے میں رہنے اور اس کے معدے میں موجود انہضامی رطوبتوں (digestive juices) کے اثرات کے باعث آپؑ کی حالت بہت خستہ (سقیم) ہو چکی تھی۔

آیت ۱۴۶ ﴿وَاَنْۢبَتْنَا عَلَيْهِ شَجَرَةً مِّنْ يَّقْطِيْنٍ ۝۱۴۶﴾ ''تو ہم نے اس کے اوپر یقطین کا ایک پودا اُگا دیا۔''

عربی میں ''یقطین'' ایسے پودے کو کہا جاتا ہے جو کسی تنے پر کھڑا نہیں ہوتا' بلکہ بیل کی شکل میں پھیلتا ہے' جیسے کدو' تربوز' ککڑی وغیرہ۔ ''یقطین'' کے بارے میں ہمارے ایک دوست جناب احمد الدین مارہروی مرحوم کی تحقیق ماہنامہ میثاق (فروری ۱۹۸۰ء) میں شائع ہوئی تھی۔ ☆ موصوف کا تعلق کراچی سے تھا' محکمہ تعلیم میں ملازم تھے اور اسی ملازمت کے دوران وہ مکران میں بھی رہے۔ میثاق کے مستقل قاری تھے۔ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت کرے' بہت نیک انسان تھے۔ انہوں نے لکھا ہے کہ مکران کا ساحل طبعی طور پر ساحلِ عراق سے مشابہ ہے۔ وہاں پر انہوں نے ایک بیل نما پودا دیکھا جسے مقامی زبان میں ''اَگین'' کہا جاتا ہے۔ اس پودے کے پتے بہت بڑے بڑے ہوتے ہیں۔ اس پر گول کدو کی شکل کا پھل لگتا ہے جو جسامت میں تربوز کے برابر اور مزے میں ککڑی جیسا ہوتا ہے۔ اس میں شیرینی بھی ہوتی ہے اور پانی کا جزو تو بہت زیادہ ہوتا ہے۔ اس کی بیل زمین پر دور دور تک پھیلی ہوتی ہے جس کے اندر بیک وقت دو چار آدمی اپنے آپ کو بخوبی چھپا سکتے ہیں۔ پتے نہایت چکنے اور ملائم ہوتے ہیں جو نیچے نرم و نازک گدوں اور اوپر اوڑھنے کے لیے ریشمی چادر کا کام دیتے ہیں۔ تری اور خنکی اتنی ہوتی ہے کہ آفتاب کی کرنیں اندر چھپے ہوئے انسان کو تکلیف نہیں دے سکتیں۔ اس کے پتوں میں قدرتی طور پر کوئی اینٹی بیکٹیریا مادہ بھی پایا جاتا ہے' جس کی وجہ سے حشرات الارض حتیٰ کہ سانپ اور بچھو بھی اس سے دور رہتے ہیں۔ جناب احمد الدین مارہروی مرحوم کا خیال تھا کہ یہ وہی پودا ہے جس کا ذکر قرآن میں ''یقطین'' کے نام سے ہوا ہے۔ انہوں نے یہ بھی لکھا تھا کہ اہل مکران کی زبان مسخ شدہ فارسی ہے' لیکن اس میں دوسری زبانوں بالخصوص عربی کے الفاظ بھی ملتے ہیں۔ چنانچہ

☆ محولہ بالا مضمون ''شَجَرَةً مِّنْ يَّقْطِيْنٍ'' بعد ازاں حکمت قرآن کے شمارہ فروری ۱۹۹۹ء میں اور پھر مئی ۲۰۰۶ء میں مکرر شائع ہوا تھا۔ (مرتب)

لسانی اور صوتی اعتبار سے یہ بات قرین قیاس ہے کہ یقطین کی ''ق'' مقامی زبان کی ''گ'' سے بدل گئی ہو (جیسے سعودی عرب میں بھی آج کل عوام ''قُمْ'' کو ''گُم'' ہی بولتے ہیں)، ''ی'' الف سے بدل گئی ہو اور ''ط'' کثرتِ استعمال سے حذف ہو گیا ہو۔ اس طرح ہوتے ہوتے اس لفظ نے ''اَگین'' کی صورت اختیار کر لی ہو۔ بہرحال اللہ تعالیٰ نے اس بیل کی صورت میں حضرت یونس علیہ السلام کے لیے anti septic ماحول' سایہ' غذائیت اور مٹھاس سے بھرپور پھل کی صورت میں تینوں بنیادی ضرورتیں پوری کر دیں۔

آیت ۱۴۷ ﴿وَاَرْسَلْنٰهُ اِلٰى مِائَةِ اَلْفٍ اَوْ يَزِيْدُوْنَ ۝۱۴۷﴾ ''پھر ہم نے اس کو بھیج دیا ایک لاکھ یا اس سے زیادہ لوگوں کی طرف۔''

یعنی صحت یاب ہو جانے کے بعد آپؑ کو دوبارہ رسالت کی ذمہ داریاں سونپ دی گئیں۔ قرآن میں اس حوالے سے کوئی اشارہ نہیں ملتا کہ دوبارہ آپؑ کو اپنی ہی قوم کی طرف بھیجا گیا تھا یا کسی اور قوم کی طرف۔ لیکن گمانِ غالب یہی ہے کہ آپؑ دوبارہ اپنی ہی قوم میں مبعوث ہوئے اور اس آیت میں آپؑ ہی کی قوم کی تعداد کے بارے میں بتایا گیا ہے۔ بہرحال سورۂ یونس میں ہم پڑھ چکے ہیں کہ آپؑ کی قوم کی توبہ قبول کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے ان سے عذاب کو ٹال دیا تھا۔ سورۂ یونس کی آیت ۹۸ میں یہ وضاحت بھی ملتی ہے کہ یہ استثناء صرف قومِ یونس ہی کو حاصل ہے۔ یعنی پوری انسانی تاریخ میں واحد مثال ہے کہ عذاب کے آثار ظاہر ہو جانے کے بعد آپؑ کی قوم کی توبہ قبول کر لی گئی۔

آیت ۱۴۸ ﴿فَاٰمَنُوْا فَمَتَّعْنٰهُمْ اِلٰى حِيْنٍ ۝۱۴۸﴾ ''تو وہ ایمان لے آئے اور ہم نے انہیں متاعِ دُنیوی عطا کر دی ایک خاص وقت تک۔''

یعنی ان کی توبہ اور ایمان کے بعد انہیں بقا کی ایک نئی مہلت (fresh lease of existance) دے دی گئی۔

آیات ۱۴۹ تا ۱۸۲

فَاسْتَفْتِهِمْ اَلِرَبِّكَ الْبَنٰتُ وَلَهُمُ الْبَنُوْنَ ۝۱۴۹ اَمْ خَلَقْنَا الْمَلٰٓئِكَةَ اِنَاثًا وَّهُمْ شٰهِدُوْنَ ۝۱۵۰ اَلَآ اِنَّهُمْ مِّنْ اِفْكِهِمْ لَيَقُوْلُوْنَ ۝۱۵۱ وَلَدَ اللّٰهُ ۙ وَاِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ ۝۱۵۲ اَصْطَفَى الْبَنٰتِ عَلَى الْبَنِيْنَ ۝۱۵۳ مَا لَكُمْ ۫ كَيْفَ تَحْكُمُوْنَ ۝۱۵۴ اَفَلَا

تَذَكَّرُوْنَ ۝ اَمْ لَكُمْ سُلْطٰنٌ مُّبِيْنٌ ۝ فَاْتُوْا بِكِتٰبِكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝
وَجَعَلُوْا بَيْنَهٗ وَبَيْنَ الْجِنَّةِ نَسَبًا ؕ وَلَقَدْ عَلِمَتِ الْجِنَّةُ اِنَّهُمْ لَمُحْضَرُوْنَ ۝
سُبْحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا يَصِفُوْنَ ۝ اِلَّا عِبَادَ اللّٰهِ الْمُخْلَصِيْنَ ۝ فَاِنَّكُمْ وَمَا
تَعْبُدُوْنَ ۝ مَآ اَنْتُمْ عَلَيْهِ بِفٰتِنِيْنَ ۝ اِلَّا مَنْ هُوَ صَالِ الْجَحِيْمِ ۝ وَمَا
مِنَّآ اِلَّا لَهٗ مَقَامٌ مَّعْلُوْمٌ ۝ وَّاِنَّا لَنَحْنُ الصَّآفُّوْنَ ۝ وَاِنَّا لَنَحْنُ
الْمُسَبِّحُوْنَ ۝ وَاِنْ كَانُوْا لَيَقُوْلُوْنَ ۝ لَوْ اَنَّ عِنْدَنَا ذِكْرًا مِّنَ الْاَوَّلِيْنَ ۝
لَكُنَّا عِبَادَ اللّٰهِ الْمُخْلَصِيْنَ ۝ فَكَفَرُوْا بِهٖ فَسَوْفَ يَعْلَمُوْنَ ۝ وَلَقَدْ سَبَقَتْ
كَلِمَتُنَا لِعِبَادِنَا الْمُرْسَلِيْنَ ۝ اِنَّهُمْ لَهُمُ الْمَنْصُوْرُوْنَ ۝ وَاِنَّ جُنْدَنَا لَهُمُ
الْغٰلِبُوْنَ ۝ فَتَوَلَّ عَنْهُمْ حَتّٰى حِيْنٍ ۝ وَّاَبْصِرْهُمْ فَسَوْفَ يُبْصِرُوْنَ ۝
اَفَبِعَذَابِنَا يَسْتَعْجِلُوْنَ ۝ فَاِذَا نَزَلَ بِسَاحَتِهِمْ فَسَآءَ صَبَاحُ الْمُنْذَرِيْنَ ۝
وَتَوَلَّ عَنْهُمْ حَتّٰى حِيْنٍ ۝ وَّاَبْصِرْ فَسَوْفَ يُبْصِرُوْنَ ۝ سُبْحٰنَ رَبِّكَ رَبِّ
الْعِزَّةِ عَمَّا يَصِفُوْنَ ۝ وَسَلٰمٌ عَلَى الْمُرْسَلِيْنَ ۝ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ
الْعٰلَمِيْنَ ۝ ع

آیت ۱۴۹ ﴿فَاسْتَفْتِهِمْ اَلِرَبِّكَ الْبَنَاتُ وَلَهُمُ الْبَنُوْنَ ۝۱۴۹﴾ ”تو (اے نبی ﷺ!) آپ ان سے پوچھیں‘ کیا تمہارے ربّ کے لیے تو بیٹیاں ہیں اور ان کے لیے بیٹے!“

یہاں مشرکینِ مکّہ کے اس عقیدے پر جرح کی جا رہی ہے کہ فرشتے اللہ کی بیٹیاں ہیں۔ یعنی یہ لوگ خود اپنے لیے تو بیٹے پسند کرتے ہیں اور بیٹیوں کو ناپسند کرتے ہیں لیکن جب یہ لوگ اللہ سے اولاد منسوب کرتے ہیں تو اس کے لیے بیٹیوں کا انتخاب کرتے ہیں۔

آیت ۱۵۰ ﴿اَمْ خَلَقْنَا الْمَلٰٓئِكَةَ اِنَاثًا وَّهُمْ شٰهِدُوْنَ ۝۱۵۰﴾ ”کیا واقعی ہم نے فرشتوں کو مؤنث بنایا تھا اور وہ اس کے گواہ ہیں؟“

کیا یہ آنکھوں دیکھی بات کہہ رہے ہیں؟

آیت ۱۵۱، ۱۵۲ ﴿اَلَآ اِنَّهُمْ مِّنْ اِفْكِهِمْ لَيَقُوْلُوْنَ ۝۱۵۱ وَلَدَ اللّٰهُ ۙ وَاِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ ۝۱۵۲﴾ ”خبردار! یقیناً یہ لوگ جھوٹ گھڑ کر کہتے ہیں‘ کہ اللہ کے اولاد ہوئی اور یقیناً یہ جھوٹے ہیں۔“

آیت ۱۵۳ ﴿اَصْطَفَى الْبَنَاتِ عَلَى الْبَنِيْنَ ۝۱۵۳﴾ ”کیا اُس نے بیٹیاں پسند کر لیں بیٹوں کو چھوڑ کر!“

آیت ۱۵۴ ﴿مَا لَكُمْ ۫ كَيْفَ تَحْكُمُوْنَ ۝۱۵۴﴾ ”تمہیں کیا ہو گیا ہے‘ تم کیسا فیصلہ کرتے ہو؟“

آیت ۱۵۵ ﴿اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ ۝۱۵۵﴾ ”کیا تم ہوش سے کام نہیں لیتے؟“

آیت ۱۵۶ ﴿اَمْ لَكُمْ سُلْطٰنٌ مُّبِيْنٌ ۝۱۵۶﴾ ”کیا تمہارے پاس کوئی واضح سند موجود ہے؟“

آیت ۱۵۷ ﴿فَاْتُوْا بِكِتٰبِكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝۱۵۷﴾ ”تو لاؤ تم اپنی کتاب اگر تم (اپنے دعوے میں) سچے ہو!“

آیت ۱۵۸ ﴿وَجَعَلُوْا بَيْنَهٗ وَبَيْنَ الْجِنَّةِ نَسَبًا ؕ﴾ ”اور انہوں نے تو اللہ کے اور جنّوں کے درمیان بھی نسبی رشتہ قائم کر دیا ہے۔“

﴿وَلَقَدْ عَلِمَتِ الْجِنَّةُ اِنَّهُمْ لَمُحْضَرُوْنَ ۝۱۵۸﴾ ”حالانکہ جنّوں کو خوب معلوم ہے کہ وہ تو گرفتار کر کے حاضر کیے جائیں گے۔“

آیت ۱۵۹ ﴿سُبْحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا يَصِفُوْنَ ۝۱۵۹﴾ ”اللہ پاک ہے ان باتوں سے جو یہ لوگ بنا رہے ہیں۔“

آیت ۱۶۰ ﴿اِلَّا عِبَادَ اللّٰهِ الْمُخْلَصِيْنَ ۝۱۶۰﴾ ”سوائے اللہ کے ان بندوں کے جو خالص کر لیے گئے ہیں۔“

اللہ کے وہ بندے جنہیں اللہ نے چُن لیا ہے‘ چاہے وہ جِنّات میں سے ہوں یا انسانوں میں سے‘ وہ قیامت کے دن کی پکڑ سے محفوظ و مامون رہیں گے۔

آیت ۱۶۱ ﴿فَاِنَّكُمْ وَمَا تَعْبُدُوْنَ ۝۱۶۱﴾ ”پس تم اور جن کو تم پوجتے ہو۔“

آیت ۱۶۲ ﴿مَآ اَنْتُمْ عَلَيْهِ بِفٰتِنِيْنَ ۝۱۶۲﴾ ”تم اللہ کے خلاف کسی کو بہکا نہیں سکتے ہو۔“

آیت ۱۶۳ ﴿اِلَّا مَنْ هُوَ صَالِ الْجَحِيْمِ ۝۱۶۳﴾ ”سوائے اُس کے جو خود جہنم میں گرنے والا ہو۔“

یہاں سے آگے چند آیات میں فرشتوں کی گفتگو کا ذکر ہے۔ اس لحاظ سے اِن آیات کا

ربط سورت کی ابتدائی آیات سے ملتا ہے۔ ابتدائی آیات میں فرشتوں کا ذکر اس طرح ہوا تھا:
﴿وَالصّٰٓفّٰتِ صَفًّا ۝۱ فَالزّٰجِرٰتِ زَجْرًا ۝۲ فَالتّٰلِيٰتِ ذِكْرًا ۝۳﴾ ''قسم ہے ان (فرشتوں) کی جو قطار در قطار صفیں باندھے حاضر رہتے ہیں۔ پھر قسم ہے ان کی جو ڈانٹنے والے ہیں۔ پھر قسم ہے ان کی جو تلاوت کرنے والے ہیں ذکر کی''۔ اب ان ہی فرشتوں کی باہمی گفتگو نقل کی جا رہی ہے:

آیت ۱۶۴ ﴿وَمَا مِنَّآ اِلَّا لَهٗ مَقَامٌ مَّعْلُوْمٌ ۝۱۶۴﴾ ''اور ہم میں سے کوئی نہیں مگر اُس کے لیے ایک مقام مقرر ہے۔''

اس کو یوں سمجھیں کہ جس طرح بادشاہوں کے درباروں میں تمام مقربین و مصاحبین میں سے ہر ایک کا کوئی خاص عہدہ، مقام اور مرتبہ مقرر ہوتا تھا۔ ان میں کوئی پنج ہزاری ہوتا تھا تو کوئی دس ہزاری اور کوئی تیس ہزاری۔ اسی طرح اللہ کے حضور فرشتوں کے بھی الگ الگ مراتب ہیں، جیسے ملائکہ مقرّبین، ملأ اعلیٰ، ملائکہ دنیا، ملائکہ اسفل وغیرہ۔ یہاں فرشتوں کا قول نقل ہوا ہے کہ ہم میں سے ہر ایک کا ایک معیّن مقام ہے، اور ہم میں سے جس کا جو درجہ اور مرتبہ مقرر ہے ہم اس سے ذرہ برابر بھی تجاوز کرنے کی مجال نہیں رکھتے۔

آیت ۱۶۵ ﴿وَاِنَّا لَنَحْنُ الصَّآفُّوْنَ ۝۱۶۵﴾ ''اور ہم تو سب کے سب صفیں باندھے کھڑے رہتے ہیں۔''

ہم اللہ تعالیٰ کے حضور صف بستہ مستعد کھڑے رہتے ہیں۔

آیت ۱۶۶ ﴿وَاِنَّا لَنَحْنُ الْمُسَبِّحُوْنَ ۝۱۶۶﴾ ''اور ہم تو سب کے سب (اپنے ربّ کی) تسبیح کرنے والے ہیں۔''

آیت ۱۶۷ ﴿وَاِنْ كَانُوْا لَيَقُوْلُوْنَ ۝۱۶۷﴾ ''اور یہ لوگ تو کہا کرتے تھے''

آیت ۱۶۸ ﴿لَوْ اَنَّ عِنْدَنَا ذِكْرًا مِّنَ الْاَوَّلِيْنَ ۝۱۶۸﴾ ''کہ اگر ہمارے پاس بھی پہلوں کی کوئی نصیحت ہوتی''

یعنی جس طرح پہلی قوموں کے پاس ''ذکر'' آیا تھا، اگر ہمارے پاس بھی آیا ہوتا، ہم پر بھی کوئی کتاب نازل ہوئی ہوتی:

آیت ۱۶۹ ﴿لَكُنَّا عِبَادَ اللّٰهِ الْمُخْلَصِيْنَ ۝۱۶۹﴾ ''تو ضرور ہم اللہ کے برگزیدہ

بندے ہوتے۔''

آیت ۱۷۰ ﴿فَكَفَرُوْا بِهٖ فَسَوْفَ يَعْلَمُوْنَ ۝۱۷۰﴾ ''مگر (اب وہ ذکر آ گیا ہے تو) انہوں نے اس کا انکار کر دیا، تو عنقریب یہ جان جائیں گے۔''

قرآن کے انکار اور کفر کی پاداش میں ان کے ساتھ جو کچھ ہونے والا ہے وہ عنقریب اسے خود دیکھ لیں گے۔

آیت ۱۷۱ ﴿وَلَقَدْ سَبَقَتْ كَلِمَتُنَا لِعِبَادِنَا الْمُرْسَلِيْنَ ۝۱۷۱﴾ ''اور ہماری یہ بات پہلے سے طے شدہ ہے اپنے ان بندوں کے لیے جن کو ہم (رسول بنا کر) بھیجتے رہے ہیں۔''

یہ آیات فلسفہ قرآنی اور اللہ تعالیٰ کے ایک خاص قانون کے اعتبار سے بہت اہم ہیں۔ اس قانون کے تحت مرسلین کے لیے یقینی مدد کا وعدہ ہے، لیکن یہ وعدہ صرف رسولوں کے لیے ہے۔ اس ضمن میں نبیوں اور رسولوں کے مابین فرق ملحوظ رکھنا چاہیے۔ چنانچہ ایک نبیؑ کے لیے لازم نہیں تھا کہ اس کے لیے اللہ کی مدد ضرور ہی آتی اور اسے ہر صورت میں غلبہ عطا کیا جاتا، بلکہ نبیوں کو تو قتل بھی کیا جاتا رہا۔ جیسے حضرت زکریا علیہ السلام اور حضرت یحییٰ علیہ السلام کو قتل کر دیا گیا تھا۔ لیکن رسولوں کے بارے میں یہ بات طے تھی کہ وہ نہ تو قتل ہوں گے اور نہ ہی مغلوب۔ چنانچہ جیسے ہی کسی رسولؑ کے مخالفین اس پر غالب آنے کی کوشش کرتے اور رسولؑ کے مغلوب ہونے کا امکان پیدا ہوتا تو اللہ کی فیصلہ کن مدد آ جاتی۔ اس کے بعد رسولؑ اور اس کے ساتھیوں کو بچا لیا جاتا اور ان کے مخالفین کو نیست و نابود کر دیا جاتا۔

آیت ۱۷۲ ﴿اِنَّهُمْ لَهُمُ الْمَنْصُوْرُوْنَ ۝۱۷۲﴾ ''کہ ان کی لازماً مدد کی جائے گی۔''

یعنی رسولوں کی ضرور مدد کی جائے گی اور وہؑ لازمی طور پر غالب ہو کر رہیں گے۔ آیت کے ترجمے میں اگرچہ مستقبل کا صیغہ استعمال کیا گیا ہے، لیکن اصل میں تو اللہ تعالیٰ کے اس قاعدے اور قانون پر عمل ماضی میں ہوتا رہا ہے اور محمدؐ رسول اللہ ﷺ پر آ کر یہ سلسلہ ختم ہو چکا ہے۔

آیت ۱۷۳ ﴿وَاِنَّ جُنْدَنَا لَهُمُ الْغٰلِبُوْنَ ۝۱۷۳﴾ ''اور یقیناً ہمارا لشکر ہی غالب رہے گا۔''

یہاں اللہ کے لشکر سے ''حزب اللہ'' (رسولؑ اور اس کے ساتھی) مراد ہیں۔ مثلاً حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور آپؑ کے حواری اپنے دور کے حزب اللہ تھے اور محمدؐ رسول اللہ اور آپؐ کے صحابہ رضی اللہ عنہم ﴿مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ ۭ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ﴾ (الفتح:۲۹) اپنے دَور کے حزب اللہ تھے۔

آیت ۱۷۴ ﴿فَتَوَلَّ عَنْهُمْ حَتّٰى حِيْنٍ ۝۱۷۴﴾ ''تو (اے نبی ﷺ!) آپ ان سے ذرا

رخ پھیر لیجیے ایک وقت تک کے لیے۔‘‘

آپؐ ان کی مخالفت کی پروا نہ کریں اور ان کی استہزائیہ باتوں سے اعراض کریں۔

آیت ۱۷۵ ﴿وَّاَبْصِرْهُمْ فَسَوْفَ يُبْصِرُوْنَ ۝۱۷۵﴾ ’’اور آپؐ انہیں دیکھتے رہیے‘ پس عنقریب وہ بھی دیکھ لیں گے۔‘‘

یعنی آپ ذرا انتظار کیجیے‘ یہ لوگ اپنی شکست اور آپ کی فتح خود اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں گے۔

آیت ۱۷۶ ﴿اَفَبِعَذَابِنَا يَسْتَعْجِلُوْنَ ۝۱۷۶﴾ ’’تو کیا یہ لوگ ہمارے عذاب کے بارے میں جلدی مچا رہے ہیں؟‘‘

آیت ۱۷۷ ﴿فَاِذَا نَزَلَ بِسَاحَتِهِمْ فَسَآءَ صَبَاحُ الْمُنْذَرِيْنَ ۝۱۷۷﴾ ’’تو جب وہ نازل ہوگا ان کے میدان میں تو وہ بہت بری صبح ہوگی ان لوگوں کی جنہیں خبردار کر دیا گیا تھا۔‘‘

’’سَاحَة‘‘ خیموں کے درمیان کھلی جگہ یا گھروں کے درمیان کھلے میدان کو کہا جاتا ہے۔ جیسے ہمارے ہاں عام طور پر آبادی کے درمیان میں ایک بڑا پارک ہوتا ہے۔

آیت ۱۷۸ ﴿وَتَوَلَّ عَنْهُمْ حَتّٰى حِيْنٍ ۝۱۷۸﴾ ’’اور آپؐ رخ پھیر لیجیے ان کی طرف سے ایک وقت تک کے لیے۔‘‘

یہاں حضور ﷺ کو دوبارہ ان سے اعراض کرنے کے بارے میں فرمایا جا رہا ہے کہ آپؐ نہ تو ان کے کفر اور انکار سے رنجیدہ ہوں اور نہ ہی ان کے انجام کے بارے میں فکرمند ہوں۔ قرآن میں اس حوالے سے آپؐ کو مخاطب کر کے بار بار فرمایا گیا: ﴿وَلَا تَحْزَنْ عَلَيْهِمْ﴾ کہ آپؐ ان کے معاملے میں بالکل رنجیدہ نہ ہوں اور سورۃ الشعراء میں تو بہت ہی پُرزور انداز میں فرمایا گیا: ﴿لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ اَلَّا يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ ۝۳﴾ ’’(اے نبی ﷺ!) شاید آپ ہلاک کر دیں گے اپنے آپ کو‘ اس لیے کہ یہ لوگ ایمان نہیں لا رہے۔‘‘

آیت ۱۷۹ ﴿وَّاَبْصِرْ فَسَوْفَ يُبْصِرُوْنَ ۝۱۷۹﴾ ’’اور آپ دیکھتے رہیے‘ عنقریب وہ بھی دیکھ لیں گے۔‘‘

آیت ۱۸۰ ﴿سُبْحٰنَ رَبِّكَ رَبِّ الْعِزَّةِ عَمَّا يَصِفُوْنَ ۝۱۸۰﴾ ’’پاک ہے آپؐ کا ربّ‘ عزت اور اقتدار کا مالک‘ ان تمام باتوں سے جو یہ لوگ بنا رہے ہیں۔‘‘

يَصِفُوْنَ کا مادہ وصف ہے اور اسی مادہ سے لفظ ’’صفت‘‘ مشتق ہے۔ اس لفظی مادہ کے حوالے سے یہ بات نوٹ کر لیجیے کہ اس سے مشتق مختلف الفاظ اللہ تعالیٰ کی قدرت اور خوبی بیان کرنے کے لیے احادیث میں تو آئے ہیں لیکن قرآن میں ایجابی اور مثبت طور پر اللہ تعالیٰ کے لیے اس مادہ سے کوئی لفظ استعمال نہیں ہوا۔ قرآن میں اللہ تعالیٰ کے بہت سے صفاتی نام آئے ہیں اور اس حوالے سے یہ بھی فرمایا گیا: ﴿لَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى﴾ (الحشر:۲۴)‘ لیکن لفظ ’’صفت‘‘ (یا وصف کے مادہ سے مشتق کسی لفظ) کے استعمال سے صراحتاً اللہ تعالیٰ کی کوئی صفت قرآن میں بیان نہیں ہوئی۔ اس مادہ سے قرآن میں جو بھی الفاظ (یصفون وغیرہ) استعمال ہوئے ہیں وہ لوگوں کے حوالے سے ہیں کہ یہ لوگ اللہ کے جو اوصاف بیان کر رہے ہیں اور اللہ کے بارے میں جو باتیں بنا رہے ہیں اللہ اس سے پاک اور بلند و برتر ہے۔

آیت ۱۸۱ ﴿وَسَلٰمٌ عَلَى الْمُرْسَلِيْنَ ۝۱۸۱﴾ ’’اور سلام ہو تمام رسولوں پر۔‘‘

آیت ۱۸۲ ﴿وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝۱۸۲﴾ ’’اور کُل حمد اور تمام شکر اللہ کے لیے ہے جو تمام جہانوں کا ربّ ہے۔‘‘

واضح رہے کہ لفظ ’’ربّ‘‘ میں مالک اور پروردگار دونوں معانی موجود ہیں۔

ہماری ویب سائٹ

www.tanzeem.org

پر ملاحظہ کیجیے:

- ☆ تنظیم اسلامی کا تعارف
- ☆ بانیٔ تنظیم اسلامی محترم ڈاکٹر اسرار احمد کا مکمل دورۂ ترجمۂ قرآن
- ☆ بانیٔ تنظیم اسلامی اور امیر تنظیم اسلامی کے مختلف خطابات
- ☆ تلاوتِ قرآن‘ دروسِ قرآن‘ دروسِ حدیث اور خطاباتِ جمعہ
- ☆ صحیح بخاری‘ صحیح مسلم‘ موطا امام مالک اور اربعین نوویؒ کے تراجم
- ☆ میثاق‘ حکمت قرآن اور ندائے خلافت کے تازہ اور سابقہ شمارے
- ☆ اردو اور انگریزی کتابیں
- ☆ آڈیو ویڈیو کیسٹس‘ سی ڈیز اور مطبوعات کی مکمل فہرست

اللہ کی عظیم کتاب ''قرآن کریم'' میں

ذکرِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم

ڈاکٹر محمد نجیب قاسمی سنبھلی ☆

خالقِ کائنات نے اپنے حبیب حضور اکرم ﷺ کو قرآن کریم میں عمومی طور پر یَا اَیُّھَا النَّبِیُّ، یَا اَیُّھَا الرَّسُوْلُ، یَا اَیُّھَا الْمُدَّثِّرُ اور یَا اَیُّھَا الْمُزَّمِّلُ جیسی صفات سے خطاب فرمایا ہے' حالانکہ دیگر انبیاء کرام علیہم السلام کو ان کے نام سے بھی خطاب فرمایا ہے۔ صرف چار جگہوں پر اسم مبارک محمد اور ایک جگہ اسم مبارک احمد قرآن کریم میں آیا ہے:

﴿وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ ۚ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ؕ﴾ (آل عمران:۱۴۴)

''اور محمد (ﷺ) ایک رسول ہی تو ہیں' ان سے پہلے بہت سے رسول گزر چکے ہیں۔''

﴿مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَآ اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمًا ۝۴۰﴾ (الاحزاب)

''(مسلمانو!) محمد (ﷺ) تم مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں ہیں' لیکن وہ اللہ کے رسول ہیں اور تمام نبیوں میں سب سے آخری نبی ہیں۔''

﴿وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَاٰمَنُوْا بِمَا نُزِّلَ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَّهُوَ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ ۙ كَفَّرَ عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ وَاَصْلَحَ بَالَهُمْ ۝۲﴾ (محمد)

''اور جو لوگ ایمان لے آئے ہیں اور انہوں نے نیک عمل کیے ہیں اور ہر اُس بات کو دل سے مانا ہے جو محمد (ﷺ) پر نازل کی گئی ہے' اور وہی حق ہے جو ان کے پروردگار کی طرف سے آیا ہے' اللہ نے ان کی برائیوں کو معاف کر دیا ہے اور ان کی حالت سنوار دی ہے۔''

☆ najeebqasmi@gmail.com

﴿مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ ؕ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗۤ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ﴾

(الفتح: ۲۹)

''محمد (ﷺ) اللہ کے رسول ہیں' اور جو لوگ ان کے ساتھ ہیں وہ کافروں کے مقابلہ میں سخت ہیں اور آپس میں ایک دوسرے کے لیے رحم دل ہیں۔''

﴿وَاِذْ قَالَ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ يٰبَنِيْۤ اِسْرَآءِيْلَ اِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ مُّصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيَّ مِنَ التَّوْرٰىةِ وَمُبَشِّرًا ۢ بِرَسُوْلٍ يَّاْتِيْ مِنْۢ بَعْدِي اسْمُهٗۤ اَحْمَدُ ؕ﴾ (الصف:٦)

''اور وہ وقت یاد کرو جب عیسیٰ بن مریم نے کہا تھا کہ: اے بنی اسرائیل! میں تمہارے پاس اللہ کا ایسا پیغمبر بن کر آیا ہوں کہ مجھ سے پہلے جو تورات (نازل ہوئی) تھی' میں اس کی تصدیق کرنے والا ہوں اور اُس رسول کی خوشخبری دینے والا ہوں جو میرے بعد آئے گا' جس کا نام احمد ہے۔''

معلوم ہوا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اپنے زمانہ ہی میں محمد رسول اللہ ﷺ کے نبی ہونے کی تصدیق فرما دی تھی۔

حضور اکرم ﷺ کا عالی مقام و مرتبہ: اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب حضرت محمد ﷺ کو ایسا عظیم الشان مقام عطا فرمایا ہے کہ کوئی بشر حتیٰ کہ نبی یا رسول بھی اس مقام تک نہیں پہنچ سکتا' چنانچہ اللہ تعالیٰ اپنے پاک کلام میں ارشاد فرماتا ہے:

﴿اَلَمْ نَشْرَحْ لَكَ صَدْرَكَ ۝۱ وَوَضَعْنَا عَنْكَ وِزْرَكَ ۝۲ الَّذِيْۤ اَنْقَضَ ظَهْرَكَ ۝۳ وَرَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ ۝۴﴾ (الشرح)

''(اے پیغمبر ﷺ!) کیا ہم نے تمہاری خاطر تمہارا سینہ کھول نہیں دیا؟ اور ہم نے تم سے تمہارا وہ بوجھ اتار دیا ہے جس نے تمہاری کمر توڑ رکھی تھی۔ اور ہم نے تمہاری خاطر تمہارے تذکرے کو اونچا مقام عطا کر دیا ہے۔''

دنیا میں کوئی لمحہ ایسا نہیں گزرتا جس میں ہزاروں مسجدوں کے میناروں سے اللہ کی وحدانیت کی شہادت کے ساتھ حضور اکرم ﷺ کے نبی ہونے کی شہادت ہر وقت نہ دی جاتی ہو اور لاکھوں مسلمان نبی اکرم ﷺ پر درود نہ بھیجتے ہوں۔ غرضیکہ اللہ تعالیٰ کے بعد سب سے زیادہ حضور اکرم ﷺ کا نام نامی اس دنیا میں لکھا' بولا' پڑھا اور سنا جاتا ہے۔

حضور اکرم ﷺ صاحبِ حوضِ کوثر: خالق کائنات نے صرف دنیا ہی میں نہیں بلکہ آپ ﷺ کو حوضِ کوثر عطا فرما کر قیامت کے روز بھی ایسے بلند و اعلیٰ مقام سے سرفراز فرمایا ہے جو صرف اور صرف حضور اکرم ﷺ کو حاصل ہے۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

﴿اِنَّآ اَعْطَيْنٰكَ الْكَوْثَرَ ① فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانْحَرْ ② اِنَّ شَانِئَكَ هُوَ الْاَبْتَرُ ③﴾ (الکوثر)

''(اے پیغمبر ﷺ!) یقین جانو ہم نے تمہیں کوثر عطا کر دی ہے۔ لہٰذا تم اپنے پروردگار (کی خوشنودی) کے لیے نماز پڑھو اور قربانی کرو۔ یقین جانو تمہارا دشمن ہی وہ ہے جس کی جڑ کٹی ہوئی ہے (یعنی جس کی نسل آگے نہ چلے گی)۔''

کوثر جنت کے اُس حوض کا نام ہے جو حضور اکرم ﷺ کے تصرف میں دیا جائے گا اور آپؐ کی اُمت کے لوگ قیامت کے دن اس سے سیراب ہوں گے۔ حوض پر رکھے ہوئے برتن آسمان کے ستاروں کے مانند کثرت سے ہوں گے۔

حضور اکرم ﷺ پر درود و سلام: اللہ تعالیٰ نے نہ صرف زمین میں بلکہ آسمانوں پر بھی اپنے نبی کو بلند مقام سے نوازا ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

﴿اِنَّ اللّٰهَ وَمَلٰٓئِكَتَهٗ يُصَلُّوْنَ عَلَى النَّبِيِّ ؕ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَيْهِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا ⑤⑥﴾ (الاحزاب)

''اللہ تعالیٰ نبی پر رحمتیں نازل فرماتا ہے اور فرشتے نبی کے لیے دعائے رحمت کرتے ہیں۔ اے ایمان والو! تم بھی نبی پر درود و سلام بھیجا کرو۔''

اس آیت میں نبی اکرم ﷺ کے اس مقام کا بیان ہے جو آسمانوں میں آپ ﷺ کو حاصل ہے اور وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ فرشتوں میں آپ ﷺ کا ذکر فرماتا ہے اور آپ ﷺ پر رحمتیں بھیجتا ہے۔ اور فرشتے بھی آپ ﷺ کی بلندیٔ درجات کے لیے دعائیں کرتے ہیں۔ اس کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے زمین والوں کو حکم دیا کہ وہ بھی آپ ﷺ پر درود و سلام بھیجا کریں۔

حضور اکرم ﷺ کا فرمان اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: کیسا عالی شان مقام حضور اکرم ﷺ کو ملا کہ آپؐ کا کلام اللہ تعالیٰ کے حکم سے ہی ہوتا تھا' جیسا کہ اللہ تعالیٰ خود ارشاد فرماتا ہے:

﴿وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى ③ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى ④﴾ (النجم)

''اور یہ اپنی خواہش سے کچھ نہیں بولتے' یہ تو خالص وحی ہے جو ان کے پاس بھیجی جاتی ہے۔''

حضور اکرم ﷺ کو لوگوں کی ہدایت کی فکر: حضور اکرم ﷺ لوگوں کی ہدایت کی اس قدر فکر فرماتے کہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

﴿لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ اَلَّا يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ ③﴾ (الشعراء)

''(اے پیغمبر ﷺ!) شاید تم اس غم میں اپنی جان ہلاک کیے جا رہے ہو کہ یہ لوگ ایمان (کیوں) نہیں لاتے!''

ہمارے نبی ﷺ کافروں اور مشرکوں کو ایمان میں داخل کرنے کی دن رات فکر فرماتے اور اس کے لیے ہر ممکن کوشش فرماتے' لیکن آج بعض مسلمان اپنے ہی بھائیوں کو کافر اور مشرک قرار دینے میں بڑی عجلت سے کام لیتے ہیں۔

حضور اکرم ﷺ نبی رحمت بنا کر بھیجے گئے: ربّ العالمین نے اپنے نبی کو رحمۃٌ لِلمُسلمین یا رحمۃٌ لِلعَرب نہیں بنایا' بلکہ رحمۃٌ للعالمین بنایا ہے' جیسا کہ فرمان الٰہی ہے:

﴿وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ ⑩⑦﴾ (الانبیاء)

''اور (اے پیغمبر ﷺ!) ہم نے تمہیں سارے جہانوں کے لیے رحمت ہی رحمت بنا کر بھیجا ہے۔''

جس نبی کو سارے جہانوں کے لیے رحمت ہی رحمت بنا کر بھیجا گیا ہو' اُس نبی کی تعلیمات میں دہشت گردی کیسے مل سکتی ہے؟ آپ ﷺ نے ہمیشہ امن و امان قائم کرنے کی تعلیمات ہی دی ہیں۔

حضور اکرم ﷺ خاتم النبیین ہیں: آپ ﷺ نبی ہونے کے ساتھ خاتم النبیین بھی ہیں۔ حضرت آدم علیہ السلام سے جاری نبوت کا سلسلہ آپ ﷺ پر ختم ہو گیا' یعنی اب کوئی نئی شریعت نہیں آئے گی۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

﴿مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَآ اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمًا ④⑩﴾ (الاحزاب)

''(مسلمانو!) محمد (ﷺ) تم مَردوں میں سے کسی کے باپ نہیں ہیں' لیکن وہ اللہ کے رسول ہیں اور تمام نبیوں میں سب سے آخری نبی ہیں۔''

حضرات ابو ہریرہ' انس بن مالک اور ثوبان رضی اللہ عنہم سے روایت ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((اَنَا خَاتَمُ النَّبِیِّیْنَ، لَا نَبِیَّ بَعْدِیْ)) (رواہ الترمذی والطبرانی)

''میں آخری نبی ہوں' میرے بعد کوئی نبی نہیں ہوگا۔''

حضور اکرم ﷺ کو عالمی رسالت سے نوازا گیا: متعدد آیات میں اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کی عالمی رسالت کو بیان کیا ہے' یہاں صرف دو آیات پیش ہیں:

﴿قُلْ یٰٓاَیُّهَا النَّاسُ اِنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَیْكُمْ جَمِیْعًا ۨ الَّذِیْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ﴾ (الاعراف:۱۵۸)

''(اے رسول ﷺ! ان سے) کہو کہ اے لوگو! میں تم سب کی طرف اُس اللہ کا بھیجا ہوا رسول ہوں جس کے قبضے میں تمام آسمانوں اور زمین کی سلطنت ہے۔''

اسی طرح اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

﴿وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِیْرًا وَّنَذِیْرًا﴾ (سبا:۲۸)

''اور (اے پیغمبر ﷺ!) ہم نے تمہیں سارے ہی انسانوں کے لیے ایسا رسول بنا کر بھیجا ہے جو خوشخبری بھی سنائے اور خبردار بھی کرے۔''

حضور اکرم ﷺ کا اُسوۂ حسنہ بنی نوع انسان کے لیے: چونکہ آپ ﷺ کو عالمی رسالت سے نوازا گیا ہے' اس لیے آپ ﷺ کی زندگی قیامت تک آنے والے تمام انسانوں کے لیے نمونہ بنائی گئی' جیسا کہ اللہ تعالیٰ بیان فرماتا ہے:

﴿لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِیْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَنْ كَانَ یَرْجُوا اللّٰهَ وَالْیَوْمَ الْاٰخِرَ وَذَكَرَ اللّٰهَ كَثِیْرًا ﴿۲۱﴾﴾ (الاحزاب)

''حقیقت یہ ہے کہ تمہارے لیے رسول اللہ (ﷺ) کی ذات میں ایک بہترین نمونہ ہے ہر اُس شخص کے لیے جو اللہ سے اور یومِ آخرت سے امید رکھتا ہو اور کثرت سے اللہ کا ذکر کرتا ہو۔''

حضور اکرم ﷺ کی زندگی کا ایک ایک لمحہ قیامت تک آنے والے انسانوں کے لیے نمونہ ہے' لہٰذا ہمیں چاہیے کہ ہم حضور اکرم ﷺ کی سنتوں پر عمل کریں۔

حضور اکرم ﷺ کا اتباع: اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب ﷺ کے اُسوہ میں دونوں جہان کی کامیابی و کامرانی مضمر رکھی ہے' لہٰذا اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کے اتباع کو لازم قرار دیا ہے۔ فرمانِ الٰہی ہے:

﴿قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِیْ یُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَیَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ ؕ﴾ (آل عمران:۳۱)

''(اے پیغمبر ﷺ! لوگوں سے) کہہ دو کہ اگر تم اللہ سے محبت رکھتے ہو تو میری پیروی کرو' اللہ تم سے محبت کرے گا اور تمہارے لیے تمہارے گناہ معاف کر دے گا۔''

اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کی سینکڑوں آیات میں اپنی اطاعت کے ساتھ اپنے رسول ﷺ کی اطاعت کا بھی حکم دیا ہے۔ ان سب جگہوں پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے بندوں سے ایک ہی مطالبہ ہے کہ فرمانِ الٰہی کی تعمیل کرو اور ارشادِ نبوی ﷺ کی اطاعت کرو۔ غرضیکہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں متعدد جگہوں پر یہ بات واضح طور پر بیان کر دی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت کے ساتھ رسول اللہ ﷺ کی اطاعت بھی ضروری ہے اور اللہ تعالیٰ کی اطاعت رسول اکرم ﷺ کی اطاعت کے بغیر ممکن ہی نہیں ہے۔

قرآن کے مفسر اول: حضور اکرم ﷺ: اللہ تعالیٰ اپنے پاک کلام میں فرماتا ہے:

﴿وَاَنْزَلْنَآ اِلَیْكَ الذِّكْرَ لِتُبَیِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَیْهِمْ وَلَعَلَّهُمْ یَتَفَكَّرُوْنَ ﴿۴۴﴾﴾ (النحل)

''یہ کتاب ہم نے آپ کی طرف اتاری ہے کہ لوگوں کی جانب جو حکم نازل فرمایا گیا ہے آپ اسے کھول کھول کر بیان کر دیں' شاید کہ وہ غور و فکر کریں۔''

اسی طرح فرمانِ الٰہی ہے:

﴿وَمَآ اَنْزَلْنَا عَلَیْكَ الْكِتٰبَ اِلَّا لِتُبَیِّنَ لَهُمُ الَّذِی اخْتَلَفُوْا فِیْهِ﴾ (النحل:٦٤)

''یہ کتاب ہم نے آپ (ﷺ) پر اس لیے اتاری ہے تاکہ آپ ان کے لیے ہر اُس چیز کو واضح کر دیں جس میں وہ اختلاف کر رہے ہیں۔''

اللہ تعالیٰ نے ان دونوں آیات میں واضح طور پر بیان فرما دیا کہ قرآن کریم کے مفسر اول حضور اکرم ﷺ ہیں اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپ ﷺ پر یہ ذمہ داری عائد کی گئی ہے کہ آپ ﷺ اُمت مسلمہ کے سامنے قرآن کریم کے احکام و مسائل کھول کھول کر بیان کریں۔ اور ہمارا یہ ایمان ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے اپنے اقوال و افعال کے ذریعہ قرآن کریم کے احکام و مسائل بیان کرنے کی ذمہ داری بحسن و خوبی انجام دی۔

تاریخ کا طویل ترین سفر حضور اکرم ﷺ کے نام: انسانی تاریخ کے سب سے لمبے سفر

(اسراء ومعراج) کا ذکر اللہ تعالیٰ نے اپنے پاک کلام میں فرمایا ہے جس میں آپ ﷺ کو آسمانوں کی سیر کرائی گئی۔ مسجد حرام (مکہ مکرمہ) سے مسجد اقصیٰ کے سفر کو ''اِسراء'' کہتے ہیں' جس کا ذکر سورۃ الاسراء (بنی اسرائیل) میں ہے۔ اور یہاں سے جو سفر آسمانوں کی طرف ہوا اس کا نام ''معراج'' ہے اور اس واقعہ کا ذکر سورۃ النجم کی آیات میں ہے۔ سورۃ النجم کی آیات ۱۳ تا ۱۸ میں وضاحت ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے (اس موقع پر) بڑی بڑی نشانیاں ملاحظہ فرمائیں۔

حضور اکرم ﷺ کی نماز: اللہ تعالیٰ کا پیار بھرا خطاب حضور اکرم ﷺ سے ہے کہ آپ رات کے بڑے حصہ میں نماز تہجد پڑھا کریں:

﴿يٰٓاَيُّهَا الْمُزَّمِّلُ ۙ﴿۱﴾ قُمِ الَّيْلَ اِلَّا قَلِيْلًا ۙ﴿۲﴾ نِّصْفَهٗٓ اَوِ انْقُصْ مِنْهُ قَلِيْلًا ۙ﴿۳﴾ اَوْ زِدْ عَلَيْهِ وَرَتِّلِ الْقُرْاٰنَ تَرْتِيْلًا ۭ﴿۴﴾﴾ (المزمل)

''اے چادر میں لپٹنے والے! رات کا تھوڑا حصہ چھوڑ کر باقی رات میں (عبادت کے لیے) کھڑے ہو جایا کرو۔ رات کا آدھا حصہ یا آدھے سے کچھ کم، یا اُس سے کچھ زیادہ۔ اور قرآن کی تلاوت اطمینان سے صاف صاف کیا کرو۔''

اسی طرح سورۃ المزمل کی کی آخری آیت میں اللہ ربّ العزت فرماتا ہے:

﴿اِنَّ رَبَّكَ يَعْلَمُ اَنَّكَ تَقُوْمُ اَدْنٰى مِنْ ثُلُثَيِ الَّيْلِ وَنِصْفَهٗ وَثُلُثَهٗ وَطَاۗىِٕفَةٌ مِّنَ الَّذِيْنَ مَعَكَ ۭ﴾ (المزمل: ۲۰)

''(اے پیغمبر ﷺ!) تمہارا پروردگار جانتا ہے کہ تم دو تہائی رات کے قریب اور کبھی آدھی رات اور کبھی ایک تہائی رات (تہجد کی نماز کے لیے) کھڑے ہوتے ہو اور تمہارے ساتھیوں (صحابہ کرام) میں سے بھی ایک جماعت (ایسا ہی کرتی ہے)۔''

حضور اکرم ﷺ کے اخلاق: اللہ تعالیٰ قرآن کریم میں اپنے نبی مکرم ﷺ کے اخلاق کے متعلق فرماتا ہے:

﴿وَاِنَّكَ لَعَلٰي خُلُقٍ عَظِيْمٍ ۝﴾

''اور یقیناً تم اخلاق کے اعلیٰ درجہ پر ہو۔''

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے جب آپ ﷺ کے اخلاق کے متعلق سوال کیا گیا تو آپؓ نے فرمایا: ((كَانَ خُلُقُهُ الْقُرْآنُ)) (رواه البخاری ومسلم) ''آپ ﷺ کا اخلاق قرآنی تعلیمات کے عین مطابق تھا۔''

خلاصۂ کلام: اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں جگہ جگہ اپنے حبیب محمد مصطفیٰ ﷺ کے اوصافِ حمیدہ بیان فرمائے ہیں۔ آپ ﷺ نہ صرف اپنے زمانہ کے لوگوں کے لیے بلکہ قیامت تک آنے والے تمام انسانوں کے لیے نبی و رسول بنا کر بھیجے گئے ہیں' اور نبوت کا سلسلہ آپ ﷺ پر ختم کر دیا گیا ہے' یعنی اب قیامت تک کوئی نبی نہیں آئے گا۔ یہی شریعت محمدیہ (یعنی علومِ قرآن وحدیث) قیامت تک آنے والے تمام انسانوں کے لیے مشعل راہ ہے۔ غرضیکہ آپ ﷺ کو عالمی رسالت سے نوازا گیا ہے۔ اتنے عظیم و بلند مقام پر فائز ہونے کے باوجود آپ ﷺ کو مختلف طریقوں سے ستایا گیا۔ آپ ﷺ کی زندگی کا بیشتر حصہ تکلیفوں میں گزرا' مگر آپ ﷺ نے کبھی صبر کا دامن نہیں چھوڑا اور آپ ﷺ رسالت کی اہم ذمہ داری کو استقامت کے ساتھ بحسن وخوبی انجام دیتے رہے۔ آپ ﷺ کی عبادات' معاملات' اخلاق اور معاشرت سارے انسانوں کے لیے نمونہ ہیں۔ ہمیں حضور اکرم ﷺ کے اسوہ سے یہ سبق لینا چاہیے کہ گھریلو یا ملکی یا عالمی سطح پر جیسے بھی حالات ہمارے اوپر آئیں' ہم ان پر صبر کریں اور اپنے نبی محترم ﷺ کے نقش قدم پر چلتے ہوئے اللہ تعالیٰ سے اپنا تعلق مضبوط کریں۔ ہم اپنے نبی ﷺ کے طریقہ پر اسی وقت زندگی گزار سکتے ہیں جب ہمیں اپنے نبی ﷺ کی سیرت معلوم ہو' لہٰذا ہم خود بھی سیرت کی کتابوں کو پڑھیں اور اپنے بچوں کو بھی سیرتِ نبوی پڑھانے کا اہتمام کریں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اپنے حبیب محمد مصطفیٰ ﷺ کے نقش قدم پر زندگی گزارنے والا بنائے۔ آمین! ❁❁❁

جہاد فی سبیل اللہ

اصل حقیقت' اہمیت ولزوم اور مراحل و مدارج

بانی تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ کا ایک جامع خطاب

اشاعت خاص: 60 روپے اشاعت عام: 30 روپے

مسلمان: دہشت گرد یا مجاہد؟

(ماخوذ از ''الجہاد فی الاسلام'')

مصنفہ سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ

تالیف: پروفیسر عبداللہ شاہین ☆

دور جدید میں غیر مسلم طاقتوں نے اپنی سیاسی اغراض کے لیے اسلام پر جو الزامات لگائے ہیں' ان میں سب سے بڑا الزام یہ ہے کہ اسلام ایک خون ریز مذہب ہے اور اپنے پیروکاروں کو ''دہشت گردی'' کی تعلیم دیتا ہے۔ اس الزام میں اگر کچھ حقیقت ہوتی تو قدرتی اور فطری طور پر اسے اس وقت پیش ہونا چاہیے تھا جب اسلام کا پرچم کرۂ ارض کے بیشتر حصہ پر لہرا رہا تھا اور مسلمان کی تلوار نے ایک تہلکہ مچا رکھا تھا۔ اُس وقت دنیا کو فی الواقع یہ شبہ ہوسکتا تھا کہ شاید یہ فاتحانہ اقدامات کسی خونریز تعلیم کا نتیجہ ہوں! مگر عجیب بات ہے کہ اس بہتان کے خیالی پتلے میں ہوا اُس وقت بھری گئی ہے جب عروجِ اسلام روبہ زوال ہے اور بہتان تراشی کرنے والوں کے اپنے ہاتھ بے گناہ مسلمانوں اور کمزور قوموں کے خون سے رنگے جا چکے ہیں —— جنہوں نے خود خون بہا بہا کر زمین کے چہرے کو رنگین کر دیا ہے' جو خود دوسری قوموں کے حقوق پر ڈاکے ڈال رہے ہیں —— کہیں ان افتا پردازوں کا منشا یہ تو نہیں کہ دنیا کی اس نفرت و ناراضی کے سیلاب کا رخ اسلام اور مسلمانوں کی طرف پھیر دیں' جس کے خود ان کے اپنے خلاف اُمنڈ آنے کا اندیشہ و خطرہ ہے؟

عجب ستم ظریفی کی بات ہے کہ ان دروغ گو طاقتوں نے تمام اُمتِ مُسلمہ اور قرآن کریم کی تعلیمات کو اس امر کا ذمہ دار قرار دینا شروع کر دیا ہے کہ اس کی تعلیم امن و امان اور سلامتی

☆ ریٹائرڈ پرنسپل' گورنمنٹ کالج حافظ آباد

کے خلاف ہے' جس نے مسلمانوں کو ایسا متعصّب بنا دیا ہے کہ وہ ہر غیر مسلم کو قابل گردن زدنی سمجھتے ہیں اور اُسے قتل کر کے جنت میں جانے کی امید رکھتے ہیں۔ یہ غلط خیالات اور پروپیگنڈا اس کثرت اور شدت سے کیا گیا ہے کہ صحیح الخیال لوگوں کی عقلیں بھی چکرا گئی ہیں۔ چنانچہ اس مسئلہ میں دنیا کی آنکھوں پر پردہ ڈالنے میں مغربی طاقتوں کو اس قدر کامیابی ہوئی ہے کہ متعدد قوموں نے بلاتحقیق اور بغیر ادنیٰ سے غور و خوض اس کو قبول کر لیا ہے۔ جبکہ سوئے اتفاق ہے کہ ان کشور کشا اور جہاں گیر قوموں کا اپنی ستم گری کے بارے میں یہ دعویٰ ہے کہ وہ دنیا میں تہذیب و تمدن اور انسانیت کی ترقی' درماندہ قوموں کی اصلاح اور امن و امان کے قیام کی خاطر چڑھائی اور جنگ کرتی ہیں۔ مگر اس زبانی دعویٰ کے برعکس ان کا عمل یہ ہے کہ کمزور قوموں کی آزادی پر نقب لگاتی ہیں اور تہذیب و انسانیت کی ترقی کے بجائے دنیا سے انسانی شرافت کی تمام خصوصیات کو مٹا رہی ہیں۔ جبکہ ''اسلام'' کے معنی ہی ''سلامتی کا دین'' ہے' اور اس کے نزدیک انسان کی جان اور اس کا خون اس قدر محترم ہے کہ:

﴿مَنْ قَتَلَ نَفْسًا بِغَيْرِ نَفْسٍ اَوْ فَسَادٍ فِي الْاَرْضِ فَكَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيْعًا﴾ (المائدۃ:۳۲)

''جس نے کسی ایک جان کو قتل کیا بغیر کسی قتل کے قصاص کے یا بغیر زمین میں فساد پھیلانے (کے جرم کی سزا) کے گویا اس نے تمام انسانیت کو قتل کر دیا۔''

نیز پیغمبر اسلام ﷺ نے خطبۂ حجۃ الوداع میں فرما دیا: ''لوگو! تمہارا خون اور مال ایک دوسرے پر حرام ہے''۔ چنانچہ اسلام نے انفرادی سطح پر: ﴿اَنَّ النَّفْسَ بِالنَّفْسِ﴾ (المائدۃ:۳۲) ''جان کے بدلے جان'' اور اجتماعی سطح پر: ﴿وَقَاتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَكُمْ﴾ (البقرۃ:۱۹۰) ''اور اللہ کی راہ میں اُن لوگوں سے جنگ کرو جو تم سے جنگ کرتے ہیں'' کا بنیادی انسانی حقوق کا قانون دفعاتِ اولین کے طور پر جاری کیا۔

انسانی جان کی حرمت کے اس اصول کی آوازِ بلند آج بھی چہار دانگِ عالم میں سنائی دیتی ہے۔ اگرچہ غیر مسلم متعصب طاقتوں نے اس کے لیے اپنے کان بند کر رکھے ہیں لیکن اس صدائے بازگشت نے انسان کو اپنی جان کی صحیح قدر و قیمت سے آگاہ کیا ہے' خواہ کسی قوم یا ملک نے اسلام کی حلقہ بگوشی اختیار کی ہو یا نہ کی ہو۔ پیش نظر رہے کہ دین اسلام نے فقط ﴿وَلَا

تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِیْ حَرَّمَ اللّٰہُ﴾ (کسی جان کو قتل نہ کرو جسے اللہ نے محترم ٹھہرایا ہے) ہی نہیں فرمایا بلکہ اس کے ساتھ ''اِلَّا بِالْحَقِّ'' کی شرط بھی لگائی ہے (بنی اسرائیل:۳۳) —— ﴿مَنْ قَتَلَ نَفْسًا بِغَیْرِ نَفْسٍ اَوْ فَسَادٍ فِی الْاَرْضِ فَکَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِیْعًا﴾ ہی نہیں فرمایا بلکہ اس کے ساتھ ﴿بِغَیْرِ نَفْسٍ﴾ (یعنی جان کے بدلے جان) ﴿اَوْ فَسَادٍ فِی الْاَرْضِ﴾ (دنیا میں فتنہ وفساد پھیلانا) کی استثناء بھی کر دی ہے۔

یہ نہیں کہ کسی انسانی جان کو کسی بھی حالت میں قتل نہیں کیا جا سکتا۔ ایسا کہا جاتا تو یہ عدل نہ ہوتا بلکہ ظلم ہوتا۔ لیکن دین اسلام ''عدل وقسط'' کا دین ہے اور دنیا کو ضرورت اس بات کی نہ تھی کہ انسان کو مادر پدر آزاد کر دیا جائے' قانون کی پکڑ سے بالا کر دیا جائے اور اسے ایسی کھلی چھٹی دے دی جائے کہ جتنا چاہے فساد مچائے' جتنی چاہے بدامنی پھیلائے اور جس قدر چاہے ظلم وستم کرے' بہرحال اس کی جان محترم ہی رہے گی۔ بلکہ اصلی ضرورت یہ تھی کہ دنیا میں امن قائم کیا جائے' فتنہ وفساد کا بیج مٹایا جائے اور ایسا قانون بنایا جائے جس کے تحت ہر شخص اپنے حدود میں آزاد ہو' البتہ کوئی شخص ایک مقرر حد سے تجاوز نہ کر پائے۔ اس غرض کے لیے محض ﴿لَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ﴾ ہی درکار نہ تھا بلکہ ''اِلَّا بِالْحَقِّ'' کی ''محافظ قوت'' بھی مطلوب تھی' ورنہ ''امن'' کی جگہ ''بدامنی'' ہوتی۔ چنانچہ اسلام کے قانونِ الٰہی نے صاف طور پر بتا دیا کہ انسانی خون کی ''حرمت'' صرف اُسی وقت ہے جب تک اس پر ''حق'' نہ قائم ہو جائے۔ اسے زندگی کا حق صرف اس کی جائز حدود کے اندر ہی دیا جا سکتا ہے۔ مگر جب وہ ان حدود سے تجاوز کر کے فتنہ وفساد پھیلائے یا دوسروں کی جان پر ''ناحق'' حملہ آور ہو تو وہ اپنے حق حیات کو خود بخود کھو دیتا ہے' اس کے خون کی حرمت زائل ہو کر ''حلت'' میں بدل جاتی ہے اور پھر اس کی موت ہی انسانیت کی حیات ہو جاتی ہے۔ چنانچہ آخری آسمانی کتاب قرآن مجید میں فرما دیا گیا ہے:

﴿وَلَکُمْ فِی الْقِصَاصِ حَیٰوۃٌ یّٰٓاُولِی الْاَلْبَابِ﴾ (البقرۃ:۱۷۹)

''اور تمہارے لیے جان کے بدلے جان (کے قانون) میں ہی زندگی ہے اے عقل والو!''

یعنی اے عقلمندو! اس قصاص کو موت نہ سمجھو' بلکہ مقتول کے بدلے میں سزا کے طور پر قاتل کی گردن زدنی تو فی الحقیقت سوسائٹی کی زندگی ہے۔ اسی لیے اسلام میں ''حُدودُ اللّٰہ'' کو قائم کرنے کی سختی کے ساتھ تاکید کی گئی ہے اور اسے رحمت و برکت کا موجب بتایا گیا ہے۔ نیز اس

سے فتنہ وفساد اور ظلم و بدامنی کی جڑ کٹتی ہے' اللہ کی مخلوق کو چین سے زندگی بسر کرنا نصیب ہوتا ہے اور قیامِ امن سے وہ طمانیت میسر آتی ہے جو تمدن کی جان اور انسانی ترقی کی روح ہے۔

یہ ''قتل بالحق'' اور ''ناگزیر خونریزی'' جس کے بغیر نہ دنیا میں امن قائم ہو سکتا ہے' نہ شر و فساد کی جڑ کٹ سکتی ہے اور نہ مخلوقِ الٰہی کو مادی و روحانی چین میسر آ سکتا ہے' اگر اسلام پر اس قانون ''مکافاتِ عمل'' کے باعث خونریزی کا الزام ہے تو اسے اس الزام کے قبول کرنے میں ذرہ برابر بھی عار نہیں —— اور اس قسم کی ''ناگزیر خون ریزی'' سے تو عیسائیت کو بھی مفر اور انکار نہیں۔ مثلاً مسیحیت بھی نظریاتی طور پر جنگ کی کُلّی تحریم کے باوجود آخرکار جنگ پر ہی مجبور ہوئی جب رومی سلطنت کے مظالم برداشت کرنا اس کے لیے ناممکن ہو گیا اور اس نے حملہ آور ہو کر سلطنتِ روما پر قبضہ کر لیا۔ پس یہ اللہ کی حکمت بالغہ ہی ہے کہ اس نے ''حرمتِ نفس'' کی تعلیم کے ساتھ ساتھ ''قوت'' کے استعمال کو ضروری قرار دیا ہے اور فرمایا ہے: ﴿وَقٰتِلُوْھُمْ حَتّٰی لَا تَکُوْنَ فِتْنَۃٌ﴾ (البقرۃ:۱۹۳' الانفال:۳۹) ''ان سے لڑے جاؤ یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے'' اور ﴿حَتّٰی تَضَعَ الْحَرْبُ اَوْزَارَھَا﴾ (محمد:۴) ''یہاں تک کہ جنگ ہتھیار ڈال دے''۔ چنانچہ ایسی اقوام کو ظلم اور تعدی سے باز رکھنے اور ان کی بڑھتی ہوئی فتنہ پروری و بدکرداری کو روکنے کے لیے جنگ ناگزیر ہو جاتی ہے۔ وگرنہ بے شمار انسانوں کی زندگی دوبھر ہو جاتی ہے اور پوری پوری قوموں پر عرصۂ حیات تنگ ہو جاتا ہے۔ کیونکہ ان ظالموں پر جہانگیری اور کشورستانی کا بھوت سوار ہوتا ہے اور وہ بے بس اور کمزور قوموں کی آزادیاں سلب کرتے ہیں' اللہ کے بے گناہ بندوں کے خون بہاتے اور آزاد انسانوں کو غلامی کا طوق پہناتے ہیں۔ ایسی حالت میں جنگ جائز ہی نہیں فرض ہو جاتی ہے۔ اُس وقت انسانیت کی سب سے بڑی خدمت یہی ہوتی ہے کہ ان مفسدوں اور فتنہ پردازوں کے شر سے اللہ کے مظلوم و بے بس بندوں کو نجات دلائی جائے۔

شاید دنیا میں کوئی تخیل پسند اخلاقی معلّم ایسا بھی ہو جس کے نزدیک ایسے ظالموں کا قتل بھی پاپ ہو۔ مگر ایسا معلّم دنیا کی اصلاح نہیں کر سکتا۔ وہ جنگلوں اور پہاڑوں میں جا کر نفس کشی اور ریاضت سے اپنی روح کو تو تسکین پہنچا سکتا ہے مگر اس کی تعلیم دنیا کو بدی سے پاک کرنے اور ظلم وسرکشی سے محفوظ رکھنے میں کبھی کامیاب نہیں ہو سکتی۔ یہ تو ممکن ہے کہ مظلوموں کے ساتھ

وہ خود بھی ظلم سہنے میں شریک ہو جائے‘ مگر بلند حوصلہ انسانوں کی ایسی جماعت تیار کرنا اُس کے بس کی بات نہیں جو ظلم کو مٹا کر عدل قائم کر دے اور انسانیت کے لیے اعلیٰ نصب العین تک پہنچنے کے وسائل آسان اور مہیا کر دے۔

عملی اخلاق و کردار‘ جس کا مقصد تمدن کا صحیح نظام قائم کرنا اور دنیا کی اصلاح کرنا ہو‘ خواہ نرمی سے ہو یا سختی سے‘ کوئی سچا اور مخلص مصلح ’’تلوار‘‘ اور ’’قلم اور زبان‘‘ میں سے کسی ایک ہی چیز کو اختیار کرنے اور صرف ایک ہی ذریعہ سے فریضۂ اصلاح انجام دینے کی یقین دہانی نہیں کرا سکتا۔ جب تک تلقین و تبلیغ شوریدہ سر جماعتوں کو اخلاق و انسانیت کی حدود کا پابند بنانے میں کارگر ہو سکتی ہو‘ تلوار کا استعمال جائز نہیں‘ مگر جب کسی جماعت یا قوم کی شرارت و بدباطنی اس حد سے گزر جائے کہ اسے باز رکھنے کے لیے جنگ کے سوا کوئی صورت (option) باقی نہ رہے تو پھر ہر سچے بہی خواہ انسانیت کا فرضِ اوّلین ہو جاتا ہے کہ اس کے خلاف تلوار اٹھائے اور اس وقت تک آرام سے نہ بیٹھے جب تک اللہ کی مخلوق کو اس کے حقوق نہ دلا دے۔

جنگ کی مذکورہ بالا جائز صورت کو جان لینے کے بعد یہ سمجھنا بہت آسان ہو جاتا ہے کہ ’’حق‘‘ کے آگے سرِ تسلیم خم کرنا اور ’’ناحق‘‘ کے آگے سر جھکانے پر موت کو ترجیح دینا ایک مشرف قوم کا خاصہ ہونا چاہیے۔

اگر کوئی قوم اعلائے حق اور اعانتِ حق کی قوت نہ رکھتی ہو تو اسے کم از کم اپنے ’’تحفظِ حق‘‘ پر سختی سے قائم رہنا چاہیے۔ لیکن اس درجے سے گر کر جو قوم اپنے حق کی حفاظت بھی نہ کر سکے اور اس میں ایثار و قربانی کا فقدان اس قدر بڑھ جائے کہ بدی و شرارت جب اس پر چڑھ کر آئے تو وہ اس کا مقابلہ کرنے بلکہ اسے مٹانے یا خود مٹ جانے کے بجائے اس کی غلامی اور اس کے ماتحت زندہ رہنے کو قبول کر لے تو ایسی قوم کے لیے دنیا میں کوئی عزت نہیں ہے‘ اس کی زندگی یقیناً موت سے بدتر ہے۔ ’’آزادی یا موت‘‘ کی اسی رمز کو سمجھانے کے لیے اللہ عزوجل نے بار بار اپنی عظیم کتاب قرآن عزیز میں ان قوموں کا ذکر کیا جنہوں نے لذاتِ نفسانی کے چھوٹ جانے کے اندیشہ اور جان و مال کے نقصان کے ڈر سے بدی کے خلاف جہاد کرنے سے جی چرایا اور بدی کا تسلّط قبول کر کے اپنے اوپر ہمیشہ کے خسران و نامرادی اور ذلّت و مسکنت کا داغ لگا لیا۔

مثال کے طور پر قرآن مجید میں ایک جگہ بنی اسرائیل قوم کی بزدلی اور جہاد سے کترانے کا نہایت عبرت ناک انجام بیان کیا ہے۔ فرمایا گیا کہ اللہ کے نبی موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم کو اللہ کی نعمتوں کو یاد دلا کر حکم دیا کہ تم شام کی ارضِ مقدس میں داخل ہو جاؤ‘ جسے اللہ نے بطور نعمت تمہاری میراث میں دیا ہے اور ہرگز پیٹھ مت پھیرنا‘ کیونکہ پیٹھ پھیر کر پسپائی اختیار کرنے والے ہمیشہ نامراد رہا کرتے ہیں‘ مگر قوم بنی اسرائیل پر دہشت چھا گئی اور:

﴿قَالُوْا يٰمُوْسٰٓى اِنَّ فِيْهَا قَوْمًا جَبَّارِيْنَ ۖ وَاِنَّا لَنْ نَّدْخُلَهَا حَتّٰى يَخْرُجُوْا مِنْهَا ۚ فَاِنْ يَّخْرُجُوْا مِنْهَا فَاِنَّا دٰخِلُوْنَ ﴿٢٢﴾ قَالَ رَجُلٰنِ مِنَ الَّذِيْنَ يَخَافُوْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمَا ادْخُلُوْا عَلَيْهِمُ الْبَابَ ۚ فَاِذَا دَخَلْتُمُوْهُ فَاِنَّكُمْ غٰلِبُوْنَ ۚ وَعَلَى اللّٰهِ فَتَوَكَّلُوْٓا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿٢٣﴾﴾ (المائدۃ)

’’انہوں نے کہا: اے موسیٰ! اس سرزمین میں تو ایک زبردست قوم ہے‘ ہم اس میں ہرگز داخل نہ ہوں گے جب تک کہ وہ وہاں سے نکل نہ جائیں۔ ہاں! اگر وہ نکل گئے تو ہم ضرور داخل ہو جائیں گے۔ (اسی قوم بنی اسرائیل کے) دو بہادر جواں مَردوں نے جو (اللہ کا) خوف رکھنے والوں میں سے تھے اور جن پر اللہ نے انعام فرمایا تھا‘ (اپنی قوم سے) کہا کہ تم ان کے مقابلے میں (بے خوف ہو کر) دروازے کے اندر داخل ہو جاؤ! اور جب تم اس میں داخل ہو گے تو تم ہی غالب رہو گے۔ اور اگر تمہیں دولتِ ایمان حاصل ہے تو تمہیں اللہ ہی پر توکل اور بھروسہ کرنا چاہیے۔‘‘

مگر وہ بزدل‘ ڈرپوک اور ذلت پر قانع رہنے والی قوم انسانوں کے خوف اور ڈر سے ہی کانپتی رہی اور اُس نے صاف کہہ دیا کہ:

﴿يٰمُوْسٰٓى اِنَّا لَنْ نَّدْخُلَهَآ اَبَدًا مَّا دَامُوْا فِيْهَا فَاذْهَبْ اَنْتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَآ اِنَّا هٰهُنَا قٰعِدُوْنَ ﴿٢٤﴾﴾

’’اے موسیٰؑ! جب تک وہ لوگ وہاں موجود ہیں‘ ہم تو اس میں ہرگز داخل نہ ہوں گے۔ پس تو اور تیرا رب جاؤ اور تم دونوں لڑو‘ ہم تو یہیں بیٹھے ہیں۔‘‘

آخر اس بزدلی کے باعث قدرتِ الٰہی نے یہ فیصلہ صادر فرما دیا کہ وہ ڈرپوک لوگ چالیس برس تک دربدر کی خاک چھانتے اور ٹھوکریں کھاتے پھریں اور کہیں ان کو ٹھکانہ نصیب نہ ہو۔ بفحوائے عبارتِ قرآنی:

﴿قَالَ فَاِنَّهَا مُحَرَّمَةٌ عَلَيْهِمْ اَرْبَعِيْنَ سَنَةً ۚ يَتِيْهُوْنَ فِي الْاَرْضِ ۭ فَلَا تَاْسَ عَلَي الْقَوْمِ الْفٰسِقِيْنَ ۝۲۶﴾

''اللہ نے فرمایا کہ (جو زمین ان کے حق میں لکھی گئی تھی) اب وہ چالیس سال تک کے لیے ان پر حرام کر دی گئی ہے' اب وہ زمین میں بھٹکتے پھریں گے۔ تو (اے موسیٰ) آپ افسوس نہ کریں اس فاسق قوم پر۔''

ایک دوسری جگہ بڑی تفصیل کے ساتھ قوم بنی اسرائیل کی اس ''محبت جان و مال'' اور ''بزدلی وخوفِ موت'' کا ذکر کیا گیا ہے جس کے باعث انہوں نے جہاد فی سبیل اللہ کو چھوڑ دیا اور آخر کار قومی ہلاکت میں مبتلا ہوئے۔ ارشاد ہے:

﴿اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ خَرَجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ وَهُمْ اُلُوْفٌ حَذَرَ الْمَوْتِ ۠ فَقَالَ لَهُمُ اللّٰهُ مُوْتُوْا ۣ ثُمَّ اَحْيَاهُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَذُوْ فَضْلٍ عَلَي النَّاسِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَشْكُرُوْنَ ۝۲۴۳﴾ (البقرۃ)

''کیا تم نے ان لوگوں کے حال پر غور نہیں کیا جو موت کے ڈر سے اپنے ملک سے نکل بھاگے' حالانکہ وہ ہزاروں کی تعداد میں تھے! پس اللہ نے ان پر موت ہی کا حکم جاری کر دیا' پھر اُس نے (مہربانی کی اور) انہیں دوبارہ زندگی بخش دی (کہ توبہ کر کے اصلاحِ حال کر لیں)۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ لوگوں پر بڑا فضل کرنے والا ہے' لیکن اکثر لوگ اس کا شکر ادا نہیں کرتے۔''

ان مثالوں کے بعد ہی اللہ عزوجل نے مسلمانوں کو قتال فی سبیل اللہ کا حکم دیا:

﴿وَقَاتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ۝۲۴۴﴾ (البقرۃ)

''اور اللہ کی راہ میں قتال و جہاد کرو اور جان لو کہ وہ خوب سننے والا اور جاننے والا ہے۔''

یہ اور ایسی بہت سی مثالیں اسی حقیقت کو سمجھانے کے لیے دی گئی ہیں کہ جس قوم سے اپنے قیام و بقا کے لیے قربانی کی روح نکل جاتی ہے' وہ بہت جلد مغلوب ہو کر فنا ہو جاتی ہے۔ اسی بنا پر تمام انسانوں خصوصاً مسلمانوں کو صرف دو راہیں بتائی گئی ہیں: شرف یا موت۔ بے شرف زندگی کی تیسری راہ بتائی ہی نہیں گئی۔ چاہے لوگوں نے اپنے ایمان کی کمزوری اور حوصلہ کی پستی سے اسے خود اختیار کر لیا ہو۔ اسلام تو اس زندگی کو ذلت و مسکنت قرار دیتا ہے اور اسے اللہ کے غضب سے تعبیر کرتا ہے' جو بزدلی اور خشیتِ ماسوی اللہ کے باعث اپنے تئیں

قہرِ الٰہی کی مستوجب ہے۔ قرآن کی زبان میں ایسی خود اختیار ذلیل زندگی پر راضی ہو جانا اپنے اوپر ظلم کرنا ہے۔ بفحوائے مفہوم آیاتِ قرآنی:

﴿اِنَّ الَّذِيْنَ تَوَفّٰىهُمُ الْمَلٰۗىِٕكَةُ ظَالِمِيْٓ اَنْفُسِهِمْ قَالُوْا فِيْمَ كُنْتُمْ ۭ قَالُوْا كُنَّا مُسْتَضْعَفِيْنَ فِي الْاَرْضِ ۭ قَالُوْٓا اَلَمْ تَكُنْ اَرْضُ اللّٰهِ وَاسِعَةً فَتُهَاجِرُوْا فِيْهَا ۭ فَاُولٰۗىِٕكَ مَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ۭ وَسَاۗءَتْ مَصِيْرًا ۝۹۷﴾ (النساء)

''جب فرشتے ان لوگوں کی روحوں کو قبض کرنے کے لیے آتے ہیں جنہوں نے (اللہ کی راہ میں ہجرت و جہاد سے اجتناب کر کے) خود اپنے آپ پر ظلم کیا تھا تو ان سے پوچھتے ہیں کہ یہ تم کس حال میں تھے؟ (تم نے کمزوری دکھاتے ہوئے بزدلی کی زندگی کیوں گزاری؟) وہ کہتے ہیں کہ ہم اس سرزمین میں مجبور اور کمزور بنا دیے گئے تھے۔ وہ (فرشتے) کہتے ہیں: کیا اللہ کی زمین کشادہ نہیں تھی کہ تم اس میں ہجرت کر جاتے؟ تو یہ وہ لوگ ہیں جن کا ٹھکانہ جہنم ہے' اور وہ بہت بری جگہ ہے ٹھہرنے کی۔''

غور کریں! کہ غیرتِ ملی کی یہ کیسی روشن تعلیم قرآنی ہے' جس میں خود کو کمزور سمجھ کر غیر حق کی اطاعت اور باطل کی غلامی پر راضی ہو جانے والوں کو اپنے اوپر آپ ظلم کرنے والے قرار دیا جا رہا ہے اور ﴿فَاُولٰۗىِٕكَ مَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ۭ وَسَاۗءَتْ مَصِيْرًا ۝۹۷﴾ کی وعید سنائی جا رہی ہے کہ ایمان وضمیر کے خلاف زندگی بسر کرنے' تن آسانی کی خاطر بندگیٔ باطل و طاغوت کی زندگی کیوں گوارا کر لی؟ آخر اسی جرم کی پاداش میں انہیں جہنم کے گڑھے میں پھینک دیا جائے گا اور اس سے بڑھ کر بری جائے بازگشت اور ذلت و نامرادی اور کوئی ہے ہی نہیں۔

یہی وجہ ہے کہ قرآن عزیز نے سب معاملات میں تحمل و بردباری کی تعلیم دی ہے مگر ایسے کسی حملے کو برداشت کرنے کی اجازت نہیں دی جو دین اسلام کو مٹانے اور مسلمانوں پر اسلام کے سوا کوئی دوسرا نظام مسلط کرنے کے لیے کیا جائے۔ حفاظتِ دین اور مدافعتِ دیار و امصارِ اسلام کا یہ ایسا سخت حکم ہے کہ جب کوئی قوت اسلام کو مٹانے اور اسلامی نظام کو فنا کرنے کے لیے حملہ آور ہو تو تمام مسلمانوں پر ''فرضِ عین'' ہو جاتا ہے کہ سب کام چھوڑ کر اس کے مقابلہ پر نکل آئیں' اور جب تک اسلام اور اسلامی نظام کو اس خطرہ سے محفوظ نہ کر لیں اس وقت تک چین سے نہ بیٹھیں۔ چنانچہ فقہ کی تمام کتابوں میں یہ حکم موجود ہے کہ جب دشمن ''دارالاسلام'' پر حملہ کرے تو ہر مسلمان پر فرداً فرداً دفاع کا فرض ایسی قطعیت کے ساتھ عائد ہو جاتا ہے جیسے نماز

اور روزہ۔

اسلام میں دفاع کے اس اہم فرض کی جو حیثیت ہے اس کا اندازہ صرف اسی سے نہیں ہوتا کہ اسے ایک عبادت اور فرضِ عین کا درجہ دیا گیا ہے اور اس کی فضیلت نماز روزہ سے بھی زیادہ بتائی گئی ہے' بلکہ غزوۂ تبوک کے موقع پر رونما ہونے والے اس اتفاقی واقعہ سے بھی ثابت ہوتا ہے جس میں حضرت محمد ﷺ کے تین اصحاب کعب بن مالک' ہلال بن امیہ اور مرارہ بن ربیع رضی اللہ عنہم کی عدم شرکت کا ذکر ہے' جو مضبوط ایمان اور نیک نیتی کے باوجود محض اتفاقی تساہل کے باعث اسلامی لشکر کے ساتھ شریکِ سفر نہ ہو سکے۔ جس پر ایسی گرفتِ ربانی آئی کہ ان کے خلاف مسلمانوں کا عام معاشرتی بائیکاٹ ہو گیا۔ حتیٰ کہ ان کی بیویوں کو بھی ان سے الگ رہنے کی تاکید کر دی گئی اور ان کا جینا دوبھر ہو گیا۔ بفحوائے الفاظِ قرآنی:

﴿وَّعَلَى الثَّلٰثَةِ الَّذِيْنَ خُلِّفُوْا ؕ حَتّٰٓى اِذَا ضَاقَتْ عَلَيْهِمُ الْاَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ وَضَاقَتْ عَلَيْهِمْ اَنْفُسُهُمْ وَظَنُّوْٓا اَنْ لَّا مَلْجَاَ مِنَ اللّٰهِ اِلَّآ اِلَيْهِ ؕ﴾

''اور ان تین پر بھی (اللہ نے رحمت کی نگاہ ڈالی) جن کا معاملہ مؤخر کر دیا گیا تھا۔ جب زمین اپنی ساری وسعت کے باوجود ان پر تنگ ہو گئی اور ان کی اپنی جانیں بھی ان پر بوجھ بن گئیں اور انہوں نے جان لیا کہ اللہ (کے غضب) سے بچنے کے لیے کوئی جائے پناہ خود اللہ ہی کے دامن رحمت کے سوا نہیں ہے۔''

آخر کار پچاس دن کے مقاطعہ کے بعد ان کی معافی ہوئی' جس کا معاملہ عند اللہ ملتوی تھا۔ ان کی توبہ کی قبولیت کا اعلان ہوا:

﴿ثُمَّ تَابَ عَلَيْهِمْ لِيَتُوْبُوْا ؕ اِنَّ اللّٰهَ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ﴿۱۱۸﴾﴾ (التوبۃ)

''پھر اللہ نے ان کی توبہ قبول فرمائی تاکہ وہ اسی کی طرف رجوع رہیں۔ یقیناً وہ بڑا معاف کرنے والا رحم فرمانے والا ہے۔''

نیز جہاد سے گریز پا ہونے کا معاملہ یہاں تک نازک ہے کہ جن (منافق) لوگوں نے رومیوں کے مقابلہ پر حفاظتِ اسلام کے لیے جنگ (غزوۂ تبوک) میں جانے سے جی چرایا تھا اور آنحضرت ﷺ نے ان کے ظاہری عذر قبول کر کے انہیں گھر بیٹھ رہنے کی اجازت دے دی تھی' اس پر آپ ﷺ کے لیے وحی الٰہی کے تنبیہی الفاظ نازل ہوئے:

﴿عَفَا اللّٰهُ عَنْكَ ۚ لِمَ اَذِنْتَ لَهُمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَتَعْلَمَ

الْكٰذِبِيْنَ ﴿۴۳﴾﴾ (التوبۃ)

''(اے محمد ﷺ!) اللہ آپ کو معاف کرے' آپ نے انہیں کیوں (جنگ سے غیر حاضر رہنے کی) اجازت دے دی؟ حتیٰ کہ آپ کو (مؤمنین) لوگ معلوم ہو جاتے اور جھوٹے (بہانے باز منافق) لوگ بھی (کھل جاتے)۔''

الغرض مسلمان اپنے دین اور اپنے قومی وجود کو کسی حال میں مغلوب نہ ہونے دیں۔ خواہ یہ شرارت ملکی ہو یا غیر ملکی' اس کا سر کچلنے کے لیے ہر وقت مستعد رہیں۔ نیز صرف اسی وقت تلوار اٹھانے کی اجازت اور ہدایت نہیں کی گئی جب شریر طاقت سر اٹھائے اور فتنہ پردازی شروع کر دے' بلکہ اس کے مقابلہ پر ہر وقت کمر بستہ اور تیار رہنے کی تاکید کی گئی ہے تاکہ اسلامی نظام کے اندرونی و بیرونی دشمنوں کو سر نکالنے کی جرأت ہی نہ ہو سکے اور ان پر حق کی ایسی دھاک اور ہیبت بیٹھی رہے کہ اس کا ہدف اندر ہی اندر مر جائے۔ لہٰذا حکم ربّ ذوالجلال ہے:

﴿وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّمِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَعَدُوَّكُمْ﴾ (الانفال: ٦٠)

''ان (اسلام دشمنوں) کے لیے جس قدر ممکن ہو' سامان جنگ اور تیار گھوڑے مہیا رکھو' اس سے تم اللہ کے دشمنوں اور اپنے دشمنوں کو مرعوب و خوف زدہ کر دو گے۔''

یعنی پہلی صدی کے تیروں' تلواروں' گھوڑوں اور موجودہ صدی کی توپوں' ٹینکوں' ہوائی جہازوں اور آبدوز کشتیوں سے خود کو لیس رکھو۔

المختصر' الفاظِ بالا سے سیاست اور جنگی حکمت عملی کا یہ نکتہ سمجھایا گیا ہے کہ اگر کوئی قوم اپنی فوجی طاقت مضبوط رکھتی ہے تو اس کے اعلانیہ اور خفیہ دشمن اس سے مرعوب و خوفزدہ رہتے ہیں اور رفتہ رفتہ ان پر ایسی دھاک بیٹھ جاتی ہے کہ دشمنی کا خیال بھی ان کے دل و دماغ سے نکل جاتا ہے۔

آخر میں اللہ عزوجل سے دعا ہے کہ ہمیں از روئے عبارتِ قرآنی ﴿هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ ۙ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ ﴿۳۳﴾﴾ (التوبۃ:۳۳' الصف:۹) دین حق یعنی اسلام کے نظامِ عدل وقسط کو غالب کرنے کی جدوجہد میں اپنے جان و مال سے شریک ہونے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین!

❁❁❁

ماں کی عظمت

پروفیسر محمد یونس جنجوعہ

اللہ تعالیٰ نے ماں باپ کے دل میں اولاد کی بے پناہ محبت ودیعت کر رکھی ہے‘ اسی کا نتیجہ ہے کہ وہ اپنی اولاد کو ہر طرح سے سکھ پہنچاتے ہیں۔ چھوٹا بچہ بے بس ہوتا ہے‘ والدین اس کی دیکھ بھال کرتے ہیں‘ اس کو ضرورت کی ہر چیز مہیا کرتے ہیں‘ بیمار ہو تو علاج کرواتے ہیں۔ بچہ بڑا ہو کر بھول جاتا ہے کہ ماں باپ نے اس کی پرورش میں کتنی مشقت برداشت کی تھی‘ چنانچہ وہ ماں باپ کا وہ حق ادا نہیں کرتا جو اسے کرنا چاہیے۔ بچے چھوٹی عمر میں ہوں تو عام طور پر ان کی ہر نافرمانی کو پیار و محبت کے تحت برداشت کر لیا جاتا ہے‘ لیکن ان کی تربیت میں سمجھ داری سے کام نہ لیا جائے تو وہی بچہ جس کو اس قدر مشقت اُٹھا کر پالا ہوتا ہے وہ گستاخ اور نافرمان ہو جاتا ہے۔ لہٰذا اس بات کی ضرورت ہوتی ہے کہ اولاد کو اپنے والدین کا حق یاد دلایا جاتا رہے اور یہ بھی کہ اگر اس نے کوتاہی کی اور نافرمانی کی روش اختیار کیے رکھی تو نہ صرف یہ اخلاقی بُرائی ہے بلکہ اللہ تعالیٰ کی ناراضی کا باعث ہے۔ نیز دنیا میں بھی اس کا بُرا نتیجہ دیکھا جا سکتا ہے۔

عالمگیر سچائی ہے کہ ہر چیز کی زیادتی برے نتائج دکھاتی ہے۔ اسی طرح والدین کو اپنی اولاد کے ساتھ جو فطری محبت ہوتی ہے‘ وہ اپنی حدود سے متجاوز نہیں ہونی چاہیے۔ انہیں غلطیوں پر متنبہ کیا جائے۔ بچوں کو شروع ہی سے اسلامی اخلاق سکھانے چاہئیں۔ قرآن وسنت کی تعلیم دی جائے۔ اس معاملے کو سنجیدگی کے ساتھ ڈیل کیا جائے۔ بچے بے سمجھ ہوتے ہیں‘ انہیں اپنے فرائض سے آگاہ کیا جائے۔ والدین کی خدمت اور اطاعت کے سلسلہ میں اللہ اور اُس کے رسول ﷺ کے احکام سے واقف کیا جائے۔

یہ تو ہیں والدین کی ذمہ داریاں۔ جب بچے چھوٹی عمر کے ہوں تو انہیں والدین کا پیار ماں باپ کے اعلیٰ مقام سے اوجھل رکھتا ہے۔ لہٰذا انہیں بار بار یاد دہانی کرائی جائے کہ والدین کی خدمت اور اطاعت ان کے لیے کس قدر ضروری ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ اولاد کی تربیت میں باپ کا بہت بڑا رول ہے۔ مگر اس سلسلہ میں ماں جو کردار ادا کرتی ہے اُس کا جواب نہیں۔ اسی لیے ماں کا مقام و مرتبہ باپ سے زیادہ بتایا گیا ہے۔ ایک صاحبؓ نے پوچھا: اے اللہ کے رسول ﷺ میرے حسنِ سلوک کا سب سے زیادہ مستحق کون ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: تمہاری ماں۔ اُس نے کہا: پھر کون؟ آپؐ نے فرمایا: تمہاری ماں۔ اس نے کہا پھر کون؟ آپؐ نے فرمایا: تمہاری ماں۔ اس نے کہا پھر کون؟ آپؐ نے فرمایا: تمہارا باپ! (صحیحین) گویا ماں کا مقام و مرتبہ باپ سے تین گنا زیادہ ہے۔

ماں بچے کی ولادت‘ رضاعت اور بچپن میں جو تکلیفیں اٹھاتی ہے قرآن میں اس کا ذکر بایں طور کیا گیا ہے:

﴿وَوَصَّيْنَا الْاِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ اِحْسٰنًا ؕ حَمَلَتْهُ اُمُّهٗ كُرْهًا وَّوَضَعَتْهُ كُرْهًا ؕ وَحَمْلُهٗ وَفِصٰلُهٗ ثَلٰثُوْنَ شَهْرًا ؕ﴾ (الاحقاف:۱۵)

''اور ہم نے انسان کو اپنے ماں باپ کے ساتھ بھلائی کرنے کی تاکید کی ہے۔ اس کی ماں تکلیف اٹھا کر اس کو پیٹ میں لیے پھری اور تکلیف ہی سے جنا۔ اُس کے حمل کا اور اُس کے دودھ چھڑانے کا زمانہ تیس مہینے کا ہے۔''

قرآن مجید میں ارشاد ہے کہ بوڑھے ماں باپ کے ساتھ نرم اور ملائم گفتگو کرو انہیں اُف تک نہ کہو۔ ان کے ساتھ بات احترام سے کرو اور اُن کے سامنے جھک کر رہو۔ (بنی اسرائیل:۲۳‘۲۴)

ماں اپنے بچے کے سلسلہ میں جو مشقت جھیلتی ہے بچہ اس کا بدلہ ہرگز نہیں دے سکتا۔ جہاد بہت بڑی عبادت ہے اور اس میں شرکت حقیقی فلاح کا باعث ہے۔ اس کے باوجود اگر کوئی نوجوان جہاد فی سبیل اللہ میں شرکت کے لیے آتا تو اللہ کے رسول ﷺ اُس سے دریافت فرماتے کہ اپنی ماں سے اجازت لے کر آئے ہو؟ اگر وہ کہتا نہیں‘ تو آپ ﷺ اُسے واپس بھیج دیتے کہ اپنی ماں سے اجازت لے کر آؤ۔ اگر وہ اجازت دے تو آؤ ورنہ وہیں رہو۔

معاویہ بن جاہمہ رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ میرے والد جاہمہؓ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا: ''میرا ارادہ جہاد میں جانے کا ہے اور میں آپؐ سے اس بارے میں مشورہ لینے کے لیے حاضر ہوا ہوں''۔ آپ ﷺ نے اُن سے پوچھا: ''کیا تمہاری ماں

ہیں؟'' انہوں نے عرض کیا: ''جی ہاں!'' آپ ﷺ نے فرمایا: ''تو پھر انہی کے پاس اور انہی کی خدمت میں رہو' ان کے قدموں میں تمہاری جنت ہے۔'' (مسند احمد' سنن نسائی)

ماں کی خدمت بڑے بڑے گناہوں کی معافی کا سبب بن جاتی ہے۔

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ ایک شخص رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا کہ: میں نے ایک بہت بڑا گناہ کیا ہے' کیا میری توبہ قبول ہوسکتی ہے (اور مجھے معافی مل سکتی ہے)؟ آپ ﷺ نے پوچھا: تمہاری ماں زندہ ہے؟ اس نے عرض کیا: ماں تو نہیں ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: تو کیا تمہاری کوئی خالہ ہے؟ اس نے عرض کیا کہ ہاں خالہ موجود ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''تو اس کی خدمت اور اس کے ساتھ اچھا سلوک کرو'' (اللہ تعالیٰ اس کی برکت سے تمہاری توبہ قبول فرمالے گا اور تمہیں معاف فرمادے گا۔) (جامع ترمذی)

ماں کے ساتھ حسن سلوک کرنا' اس کی ضروریات فراہم کرنا' اُس کو ہر طرح سے خوش رکھنا بڑے اجر کا کام ہے۔ اُس کی اطاعت اور فرمانبرداری کا حکم ہے۔ یہ اس کے احسانات کے بدلے کی ایک حقیر سی کوشش ہے۔

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''میں سویا تو میں نے خواب میں دیکھا کہ میں جنت میں ہوں' وہیں میں نے کسی کے قرآن پڑھنے کی آواز سنی' تو میں نے دریافت کیا کہ اللہ کا یہ کون بندہ ہے جو یہاں جنت میں قرآن پڑھ رہا ہے؟ تو مجھے بتایا گیا کہ یہ حارثہ بن النعمان ہیں۔ (رسول اللہ ﷺ نے اپنا یہ خواب بیان فرمانے کے بعد فرمایا کہ) ماں باپ کی خدمت واطاعت شعاری ایسی ہی چیز ہے' ماں باپ کی خدمت واطاعت شعاری ایسی ہی چیز ہے۔ حارثہ بن النعمان اپنی ماں کے بہت ہی خدمت گزار اور اطاعت شعار تھے۔'' (یعنی اس عمل نے ان کو اس مقام تک پہنچایا کہ رسول اللہ ﷺ نے جنت میں ان کی قراءت سنی۔) (شرح السنہ للبغوی وشعب الایمان)

ماں جو تکلیف اپنے بچے کے لیے برداشت کرتی ہے' بچہ زندگی بھر اس کی خدمت کرے تو بھی اُس کا بدلہ نہیں چکا سکتا۔

ایک شخص رسول اللہ ﷺ کے پاس حاضر ہوا اور شکایت کی کہ یا رسول اللہ ﷺ میری ماں بدمزاج ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''نو مہینہ تک وہ تجھے پیٹ میں اٹھائے پھری' اس وقت تو وہ بدمزاج نہ تھی''۔ وہ بولا: ''حضرت میں سچ کہتا ہوں۔ وہ بدمزاج ہی ہے''۔ حضور ﷺ نے

فرمایا: ''جب وہ رات رات بھر تیری خاطر جاگتی تھی اور تجھے اپنا دودھ پلاتی تھی اس وقت تو وہ بدمزاج نہ تھی''۔ اس آدمی نے کہا: ''میں اسے ان باتوں کا بدلہ دے چکا ہوں''۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''بھلا تو کیا بدلہ دے چکا ہے؟'' اس نے کہا: ''میں نے اسے اپنے کندھوں پر اٹھا کر حج کرایا ہے''۔ رحمتِ عالم ﷺ نے فیصلہ کن جواب دیتے ہوئے فرمایا: ''کیا تو اُسے اس تکلیف کا بدلہ بھی دے سکتا ہے جو تیری پیدائش کے وقت اس نے اٹھائی تھی؟'' (بکھرے موتی از محمد یونس پالن پوری)

چند پروفیسر حضرات فارغ وقت میں باتیں کر رہے تھے۔ ایک صاحب نے اپنے گاؤں کا ایک واقعہ سنایا۔ کہنے لگے ایک نوجوان بیمار ہوگیا۔ بڑا علاج کرایا گیا۔ اعلیٰ ڈاکٹروں تک رسائی کی مگر شفا نہ ہوئی اور مریض کو ناقابل علاج ٹھہرا دیا گیا۔ جب دواؤں سے مایوسی ہوئی تو سوچا کسی اللہ والے بزرگ کے پاس جاتے ہیں۔ چنانچہ وہ ایک نیک آدمی کے پاس گئے اور بیمار کے بارے میں بتایا۔ اس نیک انسان نے ساری باتیں اور مریض کی حالت دیکھی تو پوچھا: مریض کی ماں زندہ ہے؟ بتایا گیا کہ ہاں۔ بزرگ نے کہا کہ یہ اپنی ماں کے پاؤں دھوئے اور وہ پانی پی لیا کرے' بچا ہوا پانی کسی دیوار پر ڈال دے' گندی نالی میں نہ ڈالے۔ مریض اپنی ماں کے پاؤں دھو کر پانی پیتا رہا۔ چند دنوں میں اُس کی بیماری جاتی رہی اور وہ شفایاب ہوگیا۔

ماں کی اطاعت کرنا اور اُسے خوش رکھنا جنت میں اعلیٰ مقام کا باعث ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے پوچھا: یا اللہ میرا جنت کا ساتھی کون ہے؟ فرمایا: فلاں قصائی۔ موسیٰ علیہ السلام حیران رہ گئے۔ پھر اس قصائی کو دیکھنے چل پڑے۔ قصائی دکان میں بیٹھا گوشت بیچ رہا تھا۔ شام ہوئی تو اُس نے دکان بند کی' گوشت کا ایک ٹکڑا تھیلے میں ڈالا اور گھر چل دیا۔ موسیٰ علیہ السلام بھی ساتھ ہو گئے۔ (وہ موسیٰ علیہ السلام کو پہچانتا نہ تھا) کہنے لگے بھائی میں تمہارے ساتھ جاؤں گا۔ اس نے کہا آجائیں! گھر پہنچے تو اس نے بوٹیاں بنا کر سالن چڑھایا' آٹا گوندھا' روٹی پکائی' سالن تیار کیا۔ پھر ایک بڑھیا کو باہر لایا۔ اسے کندھے کا سہارا دے کر سیدھے ہاتھ سے لقمے بنا کر اس کو کھلائے۔ پھر اس کا منہ صاف کیا اور اُس کو لٹایا۔ وہ کچھ بڑبڑائی۔ موسیٰ علیہ السلام نے پوچھا یہ کون ہے؟ اس نے کہا یہ میری ماں ہے۔ صبح کو اس کی ساری خدمت کر کے جاتا ہوں اور رات کو آکر پہلے اس کی خدمت کرتا ہوں' پھر اپنے بال بچوں کو دیکھتا ہوں۔ موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا: یہ کچھ کہہ رہی تھی! کہنے لگا جی ہاں' روز کہتی ہے کہ اللہ تجھے موسیٰؑ کا ساتھی بنائے۔ کہاں میں قصائی' کہاں موسیٰؑ! قصائی کو کیا پتا کہ دنیا میں ہی ماں کی دعا قبول ہوگئی ہے اور موسیٰؑ

اس کے پاس بیٹھے ہیں۔ (بکھرے موتی)

ماں اپنے بچے کے ساتھ بے انتہا محبت کرتی ہے' اُس کے آرام کی خاطر اپنے آپ کو تکلیف میں ڈال لیتی ہے۔ کسی صورت اپنے بچے کو غم زدہ یا تکلیف میں نہیں دیکھ سکتی۔ جب بچہ سمجھدار اور جوان ہو جائے تو اُسے چاہیے کہ ماں کے احسانات کو یاد رکھے اور ہر ممکن طریقے سے اس کی خدمت کرے اور اسے خوش رکھے۔ مگر اکثر بچے ایسے بھی ہوتے ہیں کہ وہ نہ صرف ماں کے احسانات کو بھول جاتے ہیں بلکہ بوڑھی ماں کے ساتھ بدسلوکی کرتے ہیں۔ کچھ بیٹے شادی کے بعد اپنی بیوی پر ایسے فریفتہ ہو جاتے ہیں کہ بیوی کو ماں پر ترجیح دیتے ہیں اور بیوی کو خوش کرنے کی خاطر ماں کے ساتھ برا سلوک کرتے اور اسے اذیت دیتے ہیں۔ اس طرح اپنی عاقبت خراب کر لیتے ہیں۔

امام بخاریؒ نے اپنی کتاب المفرد میں لکھا ہے کہ ایک قبرستان میں مغرب کے بعد ایک قبر پھٹتی تھی۔ اس میں سے ایک شخص نکلتا جس کا سر گدھے کی مانند تھا۔ گدھے کی آواز نکالتا اور چند لمحے کے بعد قبر میں چلا جاتا۔ کسی نے لوگوں سے پوچھا کہ آخر اس قبر والے کے ساتھ یہ معاملہ کیوں ہو رہا ہے؟ بتانے والے نے بتایا کہ یہ آدمی شراب پیتا تھا۔ جب اس کی ماں اُسے ڈانٹتی تو کہتا تھا کیوں گدھے کی طرح چِلّاتی ہے؟ (بکھرے موتی)

ماں کو اذیت دینے والے نافرمانوں کو عاقبت کی سزا سے پہلے دنیا ہی میں سزا مل جاتی ہے۔ وہ طرح طرح کے دکھوں میں مبتلا اور پریشان رہتے ہیں۔ جبکہ فرمانبردار اور اچھا سلوک کرنے والے اپنی ماں کی نیک دعائیں لیتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی خوشنودی پاتے ہیں۔ وہ بچہ بڑا خوش نصیب ہے جو ماں کی خدمت کرتا اور اُسے ہر ممکن طریقے سے آرام اور سکھ پہنچاتا ہے اور اُس سے دعائیں لیتا ہے۔

ایک شخص جوانی کی عمر کو پہنچ گیا یا بوڑھا ہو گیا۔ اب اس کو ماں کا حق یاد آیا' جبکہ ماں تو وفات پا چکی۔ اب اُس سے اپنی کوتاہیوں کی معافی بھی نہیں مانگ سکتا۔ مگر اسلام اس موقعہ پر بھی انسان کو مایوس نہیں کرتا۔ بلکہ اگر اب وہ سچے دل سے اپنے رویے پر پشیمان ہے اور اپنی ماں کے لیے خلوصِ دل سے استغفار کرتا رہتا ہے تو اس کی بدسلوکی معاف کر دی جاتی ہے اور اللہ تعالیٰ اُسے فرماں بردار قرار دے دیتے ہیں۔ ❁❁❁

تصورِ اقبال میں عورت:
چراغِ خانہ یا شمعِ محفل؟

پروفیسر عبدالعظیم جانباز

پردہ عورت کا فطری حق ہے۔ عورت گھر میں ہو یا بازار میں، کالج میں ہو یا یونیورسٹی میں، دفتر میں ہو یا عدالت میں، اپنی فطرت کو تبدیل کرنے سے قاصر ہے۔ وہ جہاں ہوگی اس کے ضمیر کی خلش اور فطرت کی آواز اسے پردہ کرنے پر مجبور کرے گی۔ وہ بے دین قوتیں جو عورت کی فطرت سے بے بصر اور خالق فطرت کے احکامات سے ناآشنا ہیں، وہ اگر عورت کی پردہ دری کے جرم کا ارتکاب کریں تو تعجب نہیں، مگر ایک مسلمان جس کے سامنے اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے احکامات اور اپنے اکابر کا شاندار ماضی موجود ہو، اس کا اپنی بہو بیٹیوں کو پردے سے باہر لانا مردہ ضمیر کا قبیح ترین مظاہرہ ہے۔

ستم ظریفی کی حد ہے کہ وہ عورت جو عصمت اور تقدس کا نشان تھی اور جس کی عفت و نزاہت سے چاند شرماتا تھا، اسے پردے سے باہر لاکر اس سے ناپاک نظروں کی تسکین اور نفس وقلب کی تفریح کا کام لیا گیا اور یہ ظاہر کیا گیا کہ جدید تہذیب میں عورت زینت خانہ نہیں بلکہ شمع محفل ہے۔ اس کی محبت اور خلوص کی ہر ادا اپنے شوہر اور بال بچوں کے لیے وقف نہیں، بلکہ اس کی رعنائی و زیبائی فقط تماشائے عالم ہے۔ وہ تقدس کا نشان نہیں کہ اس کے احترام میں غیر محرم نظریں نیچے جھک جائیں، بلکہ وہ آج بازاروں کی رونق ہے۔

علامہ اقبال عورت کے لیے پردے کے زبردست حامی تھے۔ اقبال کی نظر میں اصل بات یہ ہے کہ آدمی کی شخصیت اور حقیقت ذات پر پردہ نہ پڑا ہو اور اس کی خودی آشکار ہو چکی ہو۔ اقبال کے نزدیک عورت کو خلوت کی ضرورت ہے اور مرد کو جلوت کی، یہی وجہ ہے کہ اقبال عورت کی بے پردگی کے خلاف ہیں۔ ان کے خیال میں پردہ میں رہ کر ہی عورت کو اپنی ذات

کے احکامات کو سمجھنے کا موقع ملتا ہے۔ اس کے برعکس جب عورت پردے سے باہر آتی ہے تو زیب وزینت، نمائش، بے باکی، بے حیائی اور ذہنی پراگندگی کا شکار ہو جاتی ہے۔ چنانچہ یہ فطری اصول ہے کہ عورت کے ذاتی جوہر خلوت میں کھلتے ہیں، جلوت میں نہیں۔ ''خلوت'' کے عنوان سے ایک نظم میں اقبال نے اسی بات کی مکمل وضاحت کی ہے۔

''ضربِ کلیم'' میں عورتوں کی آزادی یا بے راہروی کا ذمہ دار علامہ اقبال جدّت پسند مَردوں کی حماقت اور ناعاقبت اندیشی کو قرار دیتے ہیں۔ ''ضربِ کلیم'' کے اشعار ہیں:

ہزار بار حکیموں نے اس کو سلجھایا
مگر یہ مسئلہ زن رہا وہیں کا وہیں
قصور زن کا نہیں ہے کچھ اس خرابی میں
گواہ اس کی شرافت پہ ہیں مہ و پرویں
فساد کا ہے فرنگی معاشرت میں ظہور
کہ مرد سادہ ہے بیچارہ زن شناس نہیں

اقبال کے نزدیک عورت کا اصل مقام اس کا گھر ہے۔ وہ مرد کو اس کی تمام ضروریات اور اخراجات کا ذمہ دار قرار دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک عورت کو چراغِ خانہ بن کر رہنا چاہیے، شمع محفل بنے گی تو مرد کی مردانگی پر حرف آئے گا:

نے پردہ نہ تعلیم، نئی ہو کہ پرانی
نسوانیتِ زَن کا نگہباں ہے فقط مرد
جس قوم نے اس زندہ حقیقت کو نہ پایا
اس قوم کا خورشید بہت جلد ہوا زرد

اسی نقطۂ نظر کو انہوں نے ایک مضمون میں پیش کیا ہے جو ۱۹۴۴ء میں ''لور پول پوسٹ'' لندن میں شائع ہوا تھا۔ مشرق اور مغرب میں خواتین کی حیثیت پر لکھتے ہوئے وہ کہتے ہیں:

''مَیں اس خیال سے لرزہ براندام ہو جاتا ہوں کہ عورتیں قوتِ لایموت کا خود بندوبست کریں۔ اس طرزِ عمل سے نسائیت کا جوہر تباہ و برباد ہو جائے گا۔''

اقبال نے مثنوی اسرار و رموز، جاوید نامہ، ارمغانِ حجاز اور ضربِ کلیم میں متعدد مقامات پر

معاشرے میں عورت کی حیثیت و اہمیت اور اس کے تقدس و احترام پر اظہارِ خیال کیا ہے۔ وہ عورت کے معاملے میں یورپ کے طرزِ عمل پر بہت پریشان ہیں اور وہاں کی مخلوط سوسائٹی اور مخلوط تعلیم کو نفرت و بیزاری کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ ''ضربِ کلیم'' میں کہتے ہیں:

جس علم کی تاثیر سے زن ہوتی ہے نازن　　کہتے ہیں اُسی علم کو اربابِ نظر موت
بیگانہ رہے دیں سے اگر مدرسۂ زن　　ہے عشق و محبت کے لیے علم و ہنر موت

اور تہذیبِ مغرب نے جس طرح عورت کو اس کے گھر سے نکال کر زبردستی اس کے بچوں سے دور یا محروم کر کے اسے کارخانوں اور دفتروں میں لا بٹھایا ہے' اس پر اقبال ''خردمندانِ مغرب'' کو یوں شرمندہ کرتے ہیں:

کوئی پوچھے حکیمِ یورپ سے　　ہند و یوناں ہیں جس کے حلقہ بگوش!
کیا یہی ہے معاشرت کا کمال　　مرد بیکار و زن تہی آغوش!

اقبال عورتوں کی بے جا آزادی کے مخالف تھے اور اسے شمعِ محفل کی بجائے چراغِ خانہ دیکھنا چاہتے تھے۔ لکھتے ہیں: ''جس قوم نے عورتوں کو ضرورت سے زیادہ آزادی دی' وہ کبھی نہ کبھی ضرور اپنی غلطی پر پشیمان ہوئی ہے۔ عورت پر قدرت نے اتنی اہم ذمہ داریاں عائد کر رکھی ہیں کہ اگر وہ ان سے پوری طرح عہدہ برآ ہونے کی کوشش کرے تو اسے کسی دوسرے کام کی فرصت ہی نہیں مل سکتی۔ اگر اسے اس کے اصلی فرائض سے ہٹا کر ایسے کاموں پر لگایا جائے جنہیں مرد انجام دے سکتا ہے تو یہ طریق کار یقیناً غلط ہوگا' مثلاً عورت کو جس کا اصل کام آئندہ نسل کی تربیت ہے' کسی آفس میں فرنٹ ڈیسک پر بٹھا دینا نہ صرف قانونِ فطرت کی خلاف ورزی ہے' بلکہ انسانی معاشرے کو درہم برہم کرنے کی افسوسناک کوشش ہے.....''

آزادیٔ نسواں کے حامی مغرب پسند حضرات کی روش پر اقبال یوں پریشانی کا اظہار فرماتے ہیں: ''معاشرتی اصلاح کے نوجوان مبلّغ یہ سمجھتے ہیں کہ مغربی تعلیم کے چند جُرعے مسلم خواتین کے تنِ مردہ میں نئی جان ڈال دیں گے اور وہ اپنی ردائے کہنہ کو پارہ پارہ کر دے گی۔ شاید یہ بات درست ہو' لیکن مجھے اندیشہ ہے کہ اپنے آپ کو برہنہ پا کر اسے ایک مرتبہ پھر اپنا جسم ان نوجوان مبلّغین کی نگاہوں سے چھپانا پڑے گا.....''

اقبال عورتوں کے پردے کے شدت سے حامی تھے۔ چنانچہ یہ امر دلچسپی سے خالی نہیں کہ

حکومت برطانیہ نے اقبال کو جنوبی افریقہ میں اہم سفارتی عہدے کی پیشکش کی' مگر شرط یہ رکھی کہ ان کی بیگم کو مخلوط محفلوں میں جانا پڑے گا۔ اقبال نے اس شرط کو قبول نہیں کیا اور پیشکش ٹھکرا دی۔

''ملفوظاتِ اقبال'' میں روسی ترکستان کے ایک عالم موسیٰ جار اللہ سے اقبال کی گفتگو خاصی بصیرت افروز ہے۔ متعلقہ عبارت یوں ہے: ''موسیٰ جار اللہ صاحب تشریف لے آئے۔ پردے کے متعلق باتیں ہونے لگیں۔ ڈاکٹر صاحب فرمانے لگے: ''فطرت کا تقاضا معلوم ہوتا ہے کہ ہر وہ چیز جس میں تخلیقی صفات ہوں' پردے میں رہے' خود خدا کو دیکھئے' بے حجاب نہیں۔ زندگی کو لیجیے' اگرچہ اس کے آثار کو ہم دیکھ سکتے ہیں' مگر بذاتِ خود وہ ہماری نظروں سے پنہاں ہے۔'' اس پر موسیٰ جار اللہ نے کہا کہ ہم لوگ بھی پردے کے قائل تو ضرور ہیں' مگر حجابِ رُو (چہرے کا پردہ) کو ضروری نہیں سمجھتے اور نہ قرآن کریم میں اس کے متعلق کوئی نص قطعی ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے فرمایا: ''نہیں' قرآن حجابِ رو کا قائل ہے۔''

اور ''مقالات'' میں رقمطراز ہیں: ''مغربی دنیا میں نفسی نفسی کا ہنگامہ گرم ہے اور غیر معتدل مسابقت نے ایک خاص قسم کی اقتصادی حالت پیدا کر دی ہے۔ عورتوں کا آزاد کر دیا جانا ایک ایسا تجربہ ہے جو میری دانست میں بجائے کامیاب ہونے کے الٹا نقصان رساں ثابت ہوگا اور نظامِ معاشرت میں اس سے بے حد پیچیدگیاں واقع ہو جائیں گی اور عورتوں کی اعلیٰ تعلیم سے بھی جس حد تک کہ افرادِ قوم کی شرحِ ولادت کا تعلق ہے جو نتائج مرتب ہوں گے' وہ بھی غالباً پسندیدہ نہ ہوں گے.....''

اقبال زن و مرد کی ترقی' نشوونما اور تعلیم و تربیت کے لیے جداگانہ میدانِ عمل کے قائل تھے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو جسمانی طور پر بھی ایک دوسرے سے مختلف بنایا ہے اور فرائض کے اعتبار سے بھی۔ چنانچہ وہ عورتوں کے لیے ان کی طبعی و فطری ضروریات کے مطابق الگ نظام تعلیم اور الگ نصاب چاہتے تھے۔ ''شذرات'' میں لکھتے ہیں: ''تعلیم بھی دیگر امور کی طرح قومی ضروریات کے تابع ہوتی ہے۔ ہمارے مقاصد کے پیشِ نظر مسلمان بچیوں کے لیے مذہبی تعلیم بالکل کافی ہے۔ ایسے تمام مضامین جن میں عورت کو نسوانیت اور دین سے محروم کر دینے کا میلان پایا جائے' احتیاط کے ساتھ تعلیمِ نسواں سے خارج کر دیے جائیں۔''

اسی سلسلے میں ''ملفوظاتِ اقبال'' میں ان کا ایک قول نقل کیا گیا ہے: ''تعلیم کا ذکر آیا تو فرمایا

کہ مسلمانوں نے دنیا کو دکھانے کے لیے دنیوی تعلیم حاصل کرنا چاہی، لیکن نہ تو دنیا حاصل کر سکے اور نہ دین سنبھال سکے۔ یہی حال آج مسلم خواتین کا ہے جو دنیوی تعلیم حاصل کرنے کے شوق میں دین بھی کھو رہی ہیں''۔ چنانچہ ایک مرتبہ جب اقبال بھوپال میں بغرضِ علاج اپنے دوست سر راس مسعود کے ہاں مقیم تھے تو دورانِ گفتگو لیڈی مسعود کے جواب میں فرمایا:

''بے شک قرآن کریم میں حصولِ علم پر بڑا زور دیا گیا ہے، لیکن اس میں یہ کہاں لکھا ہے کہ لڑکے اور لڑکیاں ایک مکتب میں مل جل کر تعلیم حاصل کریں''۔ اسی نقطۂ نظر کی تائید اقبال نے ''ضربِ کلیم'' میں بھی کی ہے۔ وہ ایسی تعلیم کو سراسر موت قرار دیتے ہیں جس سے عورت نسوانیت کے جوہر کھو دے، وہ ایک مسلمان ماں کی خوبیوں سے محروم ہو جائے اور جس سے اس کا دینی کردار ختم ہو جائے۔

دراصل اقبال کے نزدیک اُمتِ مسلمہ کے لیے قابلِ تقلید نمونہ نبی اکرم ﷺ اور ان کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا اسوہ ہے۔ چنانچہ اسی نسبت سے وہ خواتین کو تلقین کرتے ہیں کہ حضرت فاطمہ الزہرا رضی اللہ عنہا کی پیروی اختیار کریں اور اپنی آغوش میں ایسے بچوں کی پرورش کریں جو بڑے ہو کر شبیر صفت ثابت ہوں۔ ''رموزِ بے خودی'' میں لکھتے ہیں:

مزرعِ تسلیم را حاصل بتولؓ
مادراں را اسوۂ کامل بتولؓ

اور ''ارمغانِ حجاز'' میں خواتین کو یوں نصیحت کرتے ہیں:

اگر پندے زِ درویشے پذیری
ہزار امت بہ میرد، تو نہ میری
بتولے باش و پنہاں شو ازیں عصر
کہ در آغوش شبیرے بگیری

''ایک درویش کی نصیحت کو قبول کر لو تو ہزار قومیں ختم ہو جائیں، لیکن تم ختم نہیں ہو سکتیں اور درویش کی نصیحت یہ ہے کہ بتولؓ بن کر زمانہ حاضر کی نگاہِ بد سے اوجھل ہو جاؤ (یعنی پردہ اختیار کر لو) تاکہ تم اپنی آغوش میں ایک شبیر کو پال سکو۔''

اس قولِ فیصل کے بعد اس موضوع پر مزید کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔

❁❁❁

اصلی اور فرعی مسائل میں مخالفین کے ساتھ برتاؤ کرنے کے فقہی ضابطے (۳)

تالیف: ڈاکٹر احمد بن سعد الغامدیؒ (م ۱۴۳۴ھ)

ترجمہ: ڈاکٹر صہیب حسن ☆

ضابطہ نمبر ٤:

اختلاف کو ایسے سمجھنا کہ وہ لوگوں کے درمیان ایک طبعی امر ہے

لوگوں کے درمیان فہم کے اختلاف اور مسائل کی پہچان میں اونچ نیچ چلی آتی ہے' یہ ایک قدرتی بات ہے اور اس کا بالکل ختم ہو جانا ناممکن ہے۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:

﴿وَلَوْ شَآءَ رَبُّكَ لَجَعَلَ النَّاسَ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّلَا يَزَالُوْنَ مُخْتَلِفِيْنَ ۝۱۱۸ اِلَّا مَنْ رَّحِمَ رَبُّكَ ۭ وَلِذٰلِكَ خَلَقَهُمْ ۭ وَتَمَّتْ كَلِمَةُ رَبِّكَ لَاَمْلَئَنَّ جَهَنَّمَ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ اَجْمَعِيْنَ ۝۱۱۹﴾ (ھود)

''اگر آپ کا پروردگار چاہتا تو سب لوگوں کو ایک ہی راہ پر ایک امت بنا دیتا' وہ تو برابر مختلف ہی رہیں گے' سوائے ان کے جن پر اللہ رحم فرمائے' اور انہیں تو اسی لیے پیدا کیا

☆ سیکریٹری' اسلامک شریعہ کونسل' لندن (برطانیہ)

ہے' اور آپ کے رب کی یہ بات پوری ہے کہ میں جہنم کو جنّوں اور انسانوں سب سے پر کر دوں گا۔''

اور اسی کے مطابق کہا گیا کہ اللہ عزوجل نے لوگوں کو اختلاف کے لیے پیدا کیا' گویا یہ تقدیر کے ان مقاصد میں سے ہے کہ جن سے مخلوقات میں اللہ تعالیٰ کی حکمت ظاہر ہوتی ہے۔ ابن القیم رحمہ اللہ ارشاد فرماتے ہیں:

''لوگوں کے درمیان اختلاف کا واقع ہونا ضروری ہے' اس کے بغیر کوئی چارہ نہیں' وہ اس لیے کہ ان کی سمجھ اور ادراک میں فرق پایا جاتا ہے' جو چیز قابلِ مذمّت ہے وہ یہ ہے کہ وہ ایک دوسرے کے دشمن بن جائیں اور ایک دوسرے پر چڑھ دوڑیں۔ اگر اس طرح سے ہو کہ دوری اور فرقہ بندی نہ پیدا ہو اور اختلاف کرنے والوں کا ارادہ صرف اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت ہو تو پھر یہ اختلاف ضرر رساں نہیں ہوگا کہ ایسا ہونا انسان کی جبلت میں داخل ہے' اور اگر بنیاد ایک ہو' مقصد بھی ایک ہو اور وہاں تک پہنچنے کا راستہ بھی ایک ہو تو شاید ہی اختلاف واقع ہو' اور اگر واقع ہو بھی جائے تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے مابین اختلاف کی مانند یہ اختلاف نقصان نہ پہنچائے گا' کیونکہ ان کی بنیاد ایک تھی اور وہ ہے اللہ کی کتاب اور سنتِ رسول ﷺ' ارادہ بھی ان کا ایک تھا یعنی اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت' راستہ بھی ایک تھا یعنی کتاب وسنت کے دلائل کو پیش نظر رکھنا اور انہیں ہر قول' ہر رائے' ہر قیاس' ہر مزاج اور ہر سیاست پر فوقیت دینا۔''(۱)

شاطبی رحمہ اللہ ارشاد فرماتے ہیں:

''اللہ تعالیٰ نے اپنی حکمت سے یہ فیصلہ کر دیا ہے کہ اس ملت کے فروعی مسائل فکر ونظر اور ظن وتخمین کی جولان گاہ رہیں گے۔ اہلِ علم کے ہاں یہ بات طے ہے کہ عام طور پر نظریاتی امور میں اتفاق نہیں پایا جاتا' کیونکہ ظنی امور میں اختلاف کا امکان پایا جائے گا' لیکن یہ صرف فروع میں ہوگا نہ کہ اصول میں' جزئیات تک محدود رہے گا نہ کہ کلیات تک' اور اسی لیے وہ ضرر رساں نہ ہوگا۔''(۲)

شاطبیؒ کی یہ رائے نصف اوّل میں تو سلف کے مذہب کے مطابق ہے' لیکن نصف ثانی میں متکلّمین کے مذہب کی ہم نوا ہے' کیونکہ متکلّمین فروع کی غلطی میں تو ایک دوسرے کو معذور سمجھتے ہیں لیکن جسے اصول یا عقائد کہا جاتا ہے اس میں اختلاف ہونے پر ایک دوسرے کو معذور نہیں سمجھتے' جب کہ مذہب سلف کے ماننے والے دونوں صورتوں میں معذور سمجھتے ہیں۔ ان کے

نزدیک اصل اور فرع میں فرق نہیں پایا جاتا اور نہ ہی ظنی اور قطعی میں۔ ایسی تقسیم ان کے ہاں نہیں پائی جاتی تھی' وہ اس لیے کہ ظنی اور قطعی کی تقسیم لوگوں کے ہاں نسبتاً پائی جاتی ہے' یعنی اگر ایک شخص کسی بات کو قطعی سمجھتا ہے تو دوسرا اسے ظنی قرار دیتا ہے' اور اگر ایک اسے ظنی سمجھتا ہے تو دوسرا اسے قطعی قرار دیتا ہے' اور یوں ظنی و قطعی کا دعویٰ کرنا کسی قاعدے کا پابند نہیں رہتا' اور اسی لیے احکام کا دارومدار اس پر نہیں ہوسکتا' کیونکہ احکام کا دارومدار ایسے امور پر ہوتا ہے جو کسی قاعدے کے پابند ہوں۔

حواشی

(۱) الصواعق' ۲:۵۱۹۔ (۲) الاعتصام' ۲:۱۶۸

❁❁❁

ضابطہ نمبر ۵:

لوگوں کی ذہنی صلاحیتوں کا خیال رکھنا

بعض علمی مسائل صاف اور واضح ہوتے ہیں اور بعض پوشیدہ اور مستور۔ اسی طرح عقلی مدارک میں بھی اختلاف پایا جاتا ہے کہ نصوص کی تعبیر کیسے کی جائے اور مسائل پر کیسے حکم لگایا جائے۔ یہ بات چونکہ بشر کی طبیعت میں پائی جاتی ہے اس لیے اس کا خیال کرنا نہایت ضروری ہے۔ اللہ تعالیٰ نے لوگوں کو مختلف صورتوں میں پیدا کیا ہے' ان کی صلاحیتوں اور فہم میں اختلاف رکھا ہے جس کی بنا پر ان سب کو کسی ایک فہم یا ایک صلاحیت کے تابع کرنا مشکل ہے' اس لیے ہمیں اختلاف کو قبول کرنا ہوگا' لیکن حجت اور مناظرے کے ساتھ' نہ کہ کسی قوتِ قاہرہ کے ساتھ۔ انہیں کم کرنے اور ان کی شدت میں تخفیف کرنے کی کوشش کرنا ہوگی۔ امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ ارشاد فرماتے ہیں:

> ''ہر وہ شخص جو اجتہاد کرتا ہو' استدلال کی قوت رکھتا ہو' حق جاننے کی طاقت نہیں رکھتا' اور وعید (عذابِ الٰہی) صرف اس شخص کے لیے ہے جس نے کسی امر کو چھوڑا ہو یا کسی نہی کا ارتکاب کیا ہو۔ یہی ائمہ کرام اور فقہاء کا قول ہے' یہی اس اُمت کے اسلاف سے منقول ہے اور یہی جمہور مسلمین کا قول ہے۔''(۱)

غلطی پر ہونے والے مجتہد کے بارے میں وہ ارشاد فرماتے ہیں:

> ''جو شخص بھی دلائل کا صحت نظر سے جائزہ لیتا ہے کیا ضروری ہے کہ وہ ان کے نتائج سے پوری طرح فائدہ حاصل کر سکے؟ کچھ لوگ علی الاطلاق انہیں قبول کر لیتے ہیں اور کچھ قطعی اور ظنی دلائل میں فرق روا رکھتے ہیں' یعنی وہ ان لوگوں کے ہمنوا ہیں جو یہ کہتے ہیں کہ ظنی دلائل حقیقی دلائل نہیں ہیں۔ لیکن درست بات یہ ہے کہ دلائل کو پرکھنے کے بعد اعتقاد کا حصول عقلوں کے تفاوت کی بنا پر مختلف ہوتا ہے کہ وہ کہاں تک صفاف اور شفاف ہیں' کہاں تک ذہانت اور پاکیزگی رکھتی ہیں' اور کہاں رکاوٹ تھی اور کہاں نہ تھی۔ پھر جو علم حاصل ہوگا وہ دو اَمر پر مبنی ہوگا: وہ دلائل کیا تھے اور استدلال کی نوعیت کیا تھی؟ جسمانی قویٰ کی مانند استدلالی قوت میں بھی اختلاف ہوتا ہے۔ ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک ہی دلیل کو جب ایک ذہین و فطین شخص دیکھتا ہے تو اسے یقینی علم حاصل ہو جاتا ہے اور جب اسے کم عقل والا دیکھتا ہے تو یقین کیا اسے تو سرے سے وہ دلیل ہی سمجھ میں نہیں آتی۔ حساب اور جیومیٹری کو دیکھ لو کہ ان کے نتائج یقینی ہوتے ہیں لیکن آپ خوب جانتے ہیں کہ کچھ لوگ ان کو بھی نہیں سمجھ پاتے۔ ان کا دلائل کے نتائج کو نہ سمجھنا بعض دفعہ کم عقلی یا پیدائشی کمزوری کی بنا پر ہوتا ہے اور بعض دفعہ اس لیے بھی کہ اس نے ایسے مسائل کی مشق نہیں کی ہوتی اور نہ ہی وہ ان میں دیکھنے کا عادی ہوتا ہے۔ وہ ایسے ہی ہے جیسے ایک شخص کسی چیز کو اٹھا نہیں پاتا' یا تو جسمانی کمزوری کی بنا پر' یا اس لیے کہ وہ اس کو اٹھانے کا گُر نہیں جانتا' یا یہ کہ وہ اسے اٹھانے کا عادی نہیں رہا ہے۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ وہ شدید محنت و مشقت کے بعد ایک چیز کا ادراک حاصل کر سکے' لیکن اللہ نے اسے اس کا مکلّف نہیں ٹھہرایا ہے' جیسے مریض نماز کے قیام کے لیے مکلّف نہیں ہے۔ بعض دفعہ اسے مشقت کے بعد ہی ادراک ہوتا ہے لیکن پھر بھی وہ مکلّف باقی رہتا ہے' جیسے جہاد کا وجوب ہے کہ اس میں اپنے نفس کی ہلاکت کا خوف باقی رہتا ہے پھر بھی اسے جہاد کرنا پڑتا ہے' اور بعض دفعہ بلا مشقت ہی اسے ادراک حاصل ہو جاتا ہے لیکن وہ شخص اتنے دوسرے واجب کاموں میں گھرا ہوتا ہے کہ اس کام کے لیے فارغ نہیں ہوسکتا یا اس کے پاس اتنا وقت ہی نہیں ہوتا کہ وہ اس میں غور و فکر کر سکے' اور کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ دل میں ایسے اعتقاد کا الٹ پایا جاتا ہے جس کی وجہ سے وہ صحیح طریقے سے اس مسئلہ کو دیکھ ہی نہیں سکتا۔''(۲)

اس منہج کو واضح کرنے کے لیے ہم ابن تیمیہؒ کی مثال دیتے ہیں کہ انہوں نے اپنے مخالفین کے ساتھ کیا موقف اختیار کیا۔ ابن تیمیہؒ نے الرازی کے اوپر اپنی دو کتابوں میں' جو ان

کی جلیل القدر کتابوں میں شمار ہوتی ہیں، خوب رد کیا ہے، بلکہ ان کی اکثر کتابوں میں اس کا ذکر ہوتا ہے اور پھر اس کی تردید ہوتی ہے۔ وہ ایک جگہ ان کا کلام ذکر کرنے کے بعد اس کا رد کرتے ہیں اور پھر انہیں معذور ٹھہراتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں:

''باطل فکر کی نصرت کے لیے انہوں نے ایسا جان بوجھ کر نہیں کیا ہے، بلکہ اپنی فکر وتحقیق کے مطابق وہی کچھ کہا ہے جو عقلی دلائل کہہ رہے ہیں۔ وہ اگر معقولات میں اپنے فکر ونظر کے مطابق فلسفہ کے خلاف کوئی چیز دیکھتے ہیں تو اس سے فلاسفہ کا رد کرتے ہیں۔ ان کا کام ہے اپنی رائے کے مطابق بحث کرنا، اگر انہیں کوئی چیز مخالفین کے کلام کی تردید میں نظر آتی ہے تو وہ ضرور اس کا ذکر کرتے ہیں، اور یہ سلوک سب کے ساتھ یکساں ہے۔ کچھ لوگ ان سے بدظنی کرتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ وہ جان بوجھ کر باطل کلام پیش کرتے ہیں، لیکن ایسا نہیں ہے، بلکہ وہ اپنے علم، اپنے فکر ونظر اور اپنی تحقیق کے مطابق جو بھی ظاہر ہوتا ہے، اسے پیش کرتے ہیں۔''

اس کے بعد ارشاد فرمایا:

''اگر ایک شخص کوتاہی کی انتہا تک پہنچا ہوا ہو اور اس کے زائل کرنے پر قادر نہ ہو تو اس کی یہ کوتاہی (یا عاجزی) اللہ کے ہاں عذر بن جائے گی کہ اللہ تعالیٰ اُس شخص کو سزا نہیں دیتے جو پوری طرح اجتہاد کرنے کے بعد کلام کرے۔''(۳)

مندرجہ بالا حوالے سے معلوم ہوا کہ لوگوں میں انفرادی سطح پر فرق پایا جاتا ہے، جس کے نتیجے میں نصوص کے سمجھنے اور مسائل پر حکم لگانے میں بھی فرق واقع ہوا ہے، اور یہ بات تقاضا کرتی ہے کہ مخالفین سے مناظرہ کرنے والا شخص ان فروق کا لحاظ کرے اور ان کے مطابق ہی دوسروں سے معاملہ کرے، نہ یہ کہ ان کو سرے سے خاطر ہی میں نہ لائے۔ پھر اس حقیقت کو ظاہر کرنے کے لیے جو مخالف پر واضح نہیں ہو سکی ہے، اپنی استطاعت کے مطابق نرمی سے کام لے، خاص طور پر ان دقیق مسائل میں جو مقدمات کے اور گہری معرفت کے محتاج ہوتے ہیں، تاکہ لوگوں پر ان کی طاقت سے زیادہ بوجھ نہ ڈالا جاسکے۔

حواشی

(۱) الفتاویٰ، ٤:٢٠٩۔ (۲) الفتاویٰ، ٩:٣١٣۔ (۳) الفتاویٰ ٥:٥٦١-٥٦٣۔

ضابطہ نمبر ٦:

حالات اور معاشرے کا خیال رکھنا

چین سے لے کر اندلس تک عالم اسلامی ایک بہت بڑے رقبے پر پھیلا ہوا ہے اور اس اعتبار سے طرح طرح کے معاشروں نے بھی جنم لیا ہے، اور نتیجتاً اجتہاد واستنباط کے طریقوں میں بھی اختلاف واقع ہوا ہے، جن کی وجہ سے بہت سی نصوص اور بہت سے نئے نئے مسائل کے سمجھنے میں بھی اختلاف دیکھا گیا ہے، لیکن اللہ ربّ العزت کا شکر اور احسان ہے کہ دین کے اصول اور ارکان میں اختلاف نہیں پیدا ہوا۔

اُمت کا ارکانِ اسلام پر اجماع قائم ہے، یعنی اللہ تعالیٰ کی وحدانیت اور نبی مکرمﷺ کی رسالت کا اقرار اور نماز قائم کرنے، زکوٰۃ دینے، رمضان کے روزے رکھنے اور بیت اللہ کا حج کرنے پر کُلّی اعتقاد۔ اسی طرح ارکانِ دین پر بھی اجماع ہے، یعنی اللہ پر، اس کے فرشتوں اور رسولوں پر، اس کی کتابوں پر، یومِ آخرت اور تقدیر پر ایمان رکھنا۔

بقیہ چیزوں میں اختلاف کا معاملہ اتنا سنگین نہیں ہے۔ ابن تیمیہؒ ارشاد فرماتے ہیں:

''مسلمان چاہے سنی ہوں یا بدعتی، اللہ، اُس کے فرشتوں، اُس کی کتابوں، اُس کے رسولوں اور یومِ آخرت پر ایمان کے وجوب پر متفق ہیں۔ نماز، زکوٰۃ، روزہ اور حج پر بھی ان کا اتفاق ہے، اور اس بات پر بھی کہ جو اللہ اور اس کے رسولﷺ کی اطاعت کرتا ہے تو وہ جنت میں داخل ہوگا اور اسے عذاب نہیں ہوگا، اور یہ کہ جو شخص محمدؐ رسول اللہﷺ پر ایمان نہیں رکھتا وہ کافر ہے۔ اور ایسے ہی ان سے مماثل وہ امور جو دین کے اصول و مبادی اور ایمان کے قواعد میں داخل ہیں۔ اور جن کا اسلام اور ایمان سے انتساب رکھنے والے اقرار کرتے ہیں۔ اور اس کے بعد وہ چند امور جن کا تعلق وعید سے ہے یا بعض اصطلاحات کے معنی و مطلب سے تو وہ متفقہ امور کے مقابلے میں اتنی زیادہ اہمیت نہیں رکھتے، البتہ کتاب وسنت پر مبنی کھلے اور روشن حق کی مخالفت کرنے والے جمہور امت کے نزدیک بدعتی کہلاتے ہیں، ان کی گمراہی پر مہر شہادت لگ چکی ہے، امت میں ان کا کوئی سچا گواہ نہیں اور نہ ہی انہیں قبولِ عام حاصل ہے۔ ہماری مراد ہے جیسے خوارج، روافض اور قدر کا انکار کرنے والے اور ان کی قبیل کے دوسرے لوگ۔

اور جہاں تک اہل علم' اصحابِ سنت کے درمیان اختلاف ہوا ہے تو وہ چند دقیق امور میں ہوا ہے جو اکثر لوگوں کی سمجھ سے باہر ہیں' لیکن اصل اصول یہی ہے کہ جس بات میں بھی تنازعہ ہو اُسے اللہ اور اُس کے رسول ﷺ کی طرف لوٹا دیا جائے۔''(۱)

اس لیے اگر ایک شخص مسلمانوں کے کسی معاشرے میں جاتا ہے اور وہاں اسے ایسے مسائل سے سابقہ پڑتا ہے جنہیں وہ نہیں جانتا تھا یا ان سے مانوس نہیں تھا' جیسے جہری نماز میں بسم اللہ کا آہستہ سے پڑھنا یا بلند آواز سے پڑھنا' یا طاق رکعات میں جلسہ استراحت کرنا یا نہ کرنا' یا آخری تشہد میں تورّک کر کے بیٹھنا یا نہ بیٹھنا' یعنی ایسے مسائل کہ اہلِ علم میں ان کے بارے میں اختلاف ہوا ہے تو ایسے شخص کو ان مسائل پر نکیر کرنے سے پہلے تھوڑا انتظار کرنا چاہیے تاکہ اصل مسئلہ ظاہر ہو جائے' کیونکہ بعض ایسے بھی مسائل ہیں کہ جن میں لوگوں کے حالات اور معاملات کے تنوع کے اعتبار سے اختلاف کو ملحوظ رکھا جا سکتا ہے' اور اگر اسے فتویٰ دینا بھی پڑے تو اسے حالات و معاملات کے اختلاف کا پورا پورا خیال رکھنا چاہیے۔

شوکانی رحمۃ اللہ علیہ ارشاد فرماتے ہیں:

''اللہ کی حجت کو قائم کرنے کے لیے میں تمہیں وہ راستہ دکھاتا ہوں جس سے تمہیں مدد ملے گی اور وہ یہ کہ تم اچانک لوگوں پر داخل ہو اور پھر ان کو ڈانٹنا اور دھتکارنا شروع کر دو' جو کچھ وہ کر رہے ہیں اس پر ماتم کرنا شروع کر دو اور جن باتوں سے وہ مانوس ہیں انہیں فوراً ہی چھوڑ دینے کا مطالبہ کرو بلکہ اپنے مطالبے پر اَڑ جاؤ۔ نہیں! بلکہ ان کے ساتھ وہ راستہ اپناؤ جو وہ لوگ اختیار کرتے ہیں جو دلوں کو اللہ تعالیٰ کے دیے گئے احکام کی طرف جذب کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ انہیں رغبت دلاؤ کہ شریعت کی پابندی کا کیا بڑا ثواب ہے اور ایسے ہی رائے کے مقابلہ میں دلیل کو پکڑنے اور باطل کے مقابلے میں حق کو قبول کرنے کا کیا عظیم درجہ ہے۔''(۲)

قرافیؒ ایک معاشرے میں عادات کے اختلاف اور اس کی بنا پر باہمی اختلاف کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں:

''زمانے بھر میں فتوے کا یہی چلن ہے کہ عرف چاہے وہ نیا کیوں نہ ہو' اُس کا خیال رکھو اور اگر وہ نہ رہے تو پھر اسے ساقط کر دو۔ جو کچھ کتابوں میں منقول ہے کبھی بھی ساری عمر اس پر جمود نہ کرنا' بلکہ اگر کوئی شخص کسی دوسرے علاقے سے آ کر تم سے فتویٰ طلب کرے تو فتویٰ دیتے وقت اپنے علاقے کے عرف کا مت اعتبار کرنا بلکہ اُس کے اپنے

علاقے کے عرف کے بارے میں پوچھ کر اسی کے اعتبار سے فتویٰ دینا اور کتابوں میں مذکور اقوال کا لحاظ مت رکھنا۔ یہی حق بیّن ہے' اور منقولات پر جمود کیے رہنا دین میں گمراہی ہے اور علماء سلف اور علماء مسلمین کے مقاصد سے ناواقفی ہے۔''(۳)

ابن القیمؒ' القرافیؒ کے اس قول کو ذکر کرنے کے بعد یوں تبصرہ کرتے ہیں:

''یہی اصل فقہ ہے' اور جو شخص صرف کتابوں میں منقول اقوال پر لوگوں کو فتویٰ دیتا ہے اور اس اختلاف کا خیال نہیں رکھتا جو ان کے اعراف' عادات' زمان و مکان اور حالات وقرائن میں پایا جاتا ہے تو وہ خود بھی گمراہ ہوتا ہے۔ اور لوگوں کو بھی گمراہ کرتا ہے۔ ایسا شخص دین کے معاملہ میں اس طبیب سے بڑا مجرم ہے جو مریضوں کے لیے صرف کتابوں سے دیکھ دیکھ کر نسخہ تجویز کرتا ہے اور اس اختلاف کا خیال نہیں رکھتا جو ان کے علاقوں' ان کی عادات' ان کے زمانے اور ان کی طبیعتوں میں پایا جاتا ہے۔ ایسا طبیب اور ایسا مفتی دونوں کے دونوں جاہل ہیں' لوگوں کے بدن اور لوگوں کے دین سے کھیلتے ہیں۔ پس اللہ ہی مددگار ہے۔''(۴)

ایک اور جگہ پر ابن القیمؒ ارشاد فرماتے ہیں:

''ایک مفتی اور حاکم حق کے مطابق اسی وقت فتویٰ دے سکتا ہے جب کہ دو طرح کی سمجھ رکھتا ہو۔ پہلی بات یہ ہے کہ وہ واقع کو سمجھتا ہو اور تمام قرائن اور علامات کو دیکھ کر جو بھی واقع ہوا ہے اس کی حقیقت کا ادراک رکھتا ہو' اور دوسری بات یہ ہے کہ اس واقع پر لگنے والے حکم کی سمجھ رکھتا ہو' یہی اس قسم کے واقع میں اللہ کی کتاب سے اور سنت رسول سے کیا حکم سمجھا جا سکتا ہے۔ پھر ایک کا دوسرے پر انطباق کرے۔ ایسا شخص اس عمل میں اگر پوری محنت صرف کرے اور اپنی استطاعت کے مطابق تمام امور کا احاطہ کرے تو ایک اجر یا دوہرے اجر سے محروم نہ ہوگا۔ صحیح عالم وہی ہے جو واقع کی پوری تفصیلات سے آگاہ ہو کر پہلے اسے سمجھتا ہے اور پھر اللہ اور اس کے رسول کے حکم تک پہنچ پاتا ہے۔(۵)

ابن القیم رحمہ اللہ کہتے ہیں:

''یہاں سمجھ کے دو پہلو ہیں جو ایک حاکم کے لیے انتہائی ضروری ہیں: عمومی طور پر تمام واقعات کے احکام کی سمجھ رکھنا اور دوسرے یہ کہ نفس واقعہ اور لوگوں کے حالات کی سمجھ رکھنا کہ جس سے سچے اور جھوٹے' اور حق و باطل کے درمیان امتیاز ہو سکے۔ پھر وہ دونوں باتوں میں تطبیق دے سکے اور پھر اس واقع پر جو بھی حکم واجب ہوتا ہے' لگائے اور اس کا یہ حکم واقعے کے خلاف نہ جاتا ہو۔''(۶)

امام ابن القیم نے اپنی کتاب ''اِعلام الموقعین عن رَبِّ العالمین'' میں زمان و مکان کے اختلاف کی بنا پر فتوے کے مختلف ہونے کے بارے میں پورا ایک باب باندھا ہے' جس کا عنوان ہے: ''عادات' نیّات' احوال اور زمان و مکان کے بدلنے کی بنا پر فتوے کا بدلتے رہنا''۔ پھر وہ کہتے ہیں:

''یہ بات انتہائی سودمند ہے اور اس سے ناواقفیت کی بنا پر شریعت سے بہت سی غلط باتیں منسوب ہو جاتی ہیں اور جس کی وجہ سے لوگ حرج اور مشقت میں پڑ جاتے ہیں اور ایسی باتوں کے مکلّف قرار دیے جاتے ہیں جن کا کرنا تقریباً ناممکن ہوتا ہے۔ اور جاننے والے جانتے ہیں کہ وہ شریعت جو اعلیٰ ترین مصالح پر مبنی ہے وہ ان چیزوں کی کیسے اجازت دے سکتی ہے' اس لیے کہ شریعت ان حکمتوں اور مصالح پر استوار ہوئی ہے جو لوگوں کی معیشت اور ان کے مستقبل دونوں کے لیے مفید ہیں۔''(۷)

اور اس کا مطلب یہ ہوا کہ پچھلے زمانوں میں صادر ہونے والے اکثر فتاویٰ عصرِ حاضر کے قابل نہیں ہیں' اس لیے کہ حالات اور مواقع بدل چکے ہیں۔ امام شافعی رحمہ اللہ جب عراق سے نکل کر مصر میں آ بسے تو انہیں ایسے حالات سے سابقہ پیش آیا جو عراق میں دیکھنے میں نہیں آئے تھے' اس لیے انہوں نے حالات اور جگہ کی تبدیلی کی بنا پر اپنے فتاویٰ میں بھی تبدیلی کی اور اپنے مذہب میں بھی اصلاح کی' اور اس طرح ان کے بارے میں کہا گیا کہ ان کے دو مذہب یعنی ایک قدیم اور ایک جدید ہیں۔ اس لیے مخالفین سے بات چیت کرتے وقت لوگوں کے حالات اور معاملات کا خیال رکھنا چاہیے۔ مثال کے طور پر آج مغرب میں رہنے والے مسلمانوں کے لیے جو چیز مناسب ہے وہ مسلم ممالک میں رہنے والے مسلمانوں کے لیے شاید مناسب نہ ہو۔

حواشی

(۱) الفتاویٰ' ۲:۱۳۰۔ (۲) أدب الطلب ومنتهى الأرب' ص ٥٦۔

(۳) أنوار البروق فی انواء الفروق' ۲:۲۲۹

(٤) اعلام الموقعین ۳:۲٥٤۔

(٥) الطرق الحکمیة' ۱:۱۳۱

(٦) اعلام الموقعین ۲:٤۲٥۔

(۷) ایضاً۔

ضابطہ نمبر ۷:

اجتہاد پر مبنی مسائل کا انکار نہیں کیا جا سکتا اِلّا یہ کہ وہ نصِّ صریح کے مخالف ہوں

فقہ اسلامی کے موضوع پر موجود کتابوں میں ایسے سینکڑوں مسائل ہیں جن میں علماء نے اختلاف کیا ہے' اور دیکھا جاتا ہے کہ صاحب فتویٰ کی فہم پر مبنی اجتہاد اس مسئلہ میں دیے گئے حکم کے باعث ہوتا ہے۔ اس لیے اگر یہ اجتہاد کسی صریح دلیل کے مخالف نہ ہو تو اسے جھٹلایا نہیں جا سکتا' کیونکہ ایک مجتہد کے قول کو دوسرے مجتہد کے قول سے زیادہ صحیح قرار دینا مناسب نہیں ہے۔ وہ اس لیے کہ غلطی سے معصوم ذات صرف نبی ﷺ کی ہی ہے۔

ابن تیمیہؒ کہتے ہیں:

''اگر ایک مسئلہ میں نہ ہی کوئی سنت منقول ہو اور نہ ہی اجماع' اور وہاں اجتہاد کی گنجائش ہو تو اس پر عمل کرنے والے پر انکار نہیں کیا جا سکتا' چاہے وہ مجتہد ہو یا مقلد ہو۔''(۱)

ابن تیمیہ اہل سنت اور اہل بدعت دونوں کے طریقوں کی وضاحت کرتے ہوئے کہتے ہیں:

''اصولی مسائل ہوں یا فروعی' امت کی صفوں میں جن مسائل میں اختلاف واقع ہوا ہے' جب تک انہیں اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی طرف نہ لوٹایا جائے' اس وقت تک حق واضح نہیں ہوتا' بلکہ اختلاف کرنے والے بغیر دلیل کے جھگڑتے نظر آتے ہیں۔ اگر اللہ کی رحمت ان کے ساتھ شامل حال ہو تو وہ ایک دوسرے کا لحاظ رکھتے ہیں اور ایک دوسرے پر زیادتی نہیں کرتے' جیسے حضرت عمر اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہما کی خلافت میں بعض اجتہادی مسائل میں لوگوں کا حال تھا' وہ ایک دوسرے کو مانتے تھے اور ان پر زیادتی نہیں کرتے تھے۔ اور اگر اللہ کی رحمت شامل حال نہ ہو تو ان کے درمیان مذمت کے قابل اختلاف واقع ہو جاتا ہے' اور پھر ایک دوسرے پر زیادتی کرتے نظر آتے ہیں' چاہے وہ قول سے ہو' یعنی کسی کو کافر یا فاسق قرار دینا' یا فعل سے ہو' جیسے اسے مارنا' قتل کرنا یا جیل میں ڈال دینا۔ اہل بدعت جیسے خوارج وغیرہ کا یہی حال رہا ہے' یہ لوگ دین کے مسائل میں اتنے جھگڑالو ہو جاتے ہیں کہ امت پر ظلم اور زیادتی کرتے ہیں۔ ایسے ہی تمام بدعتیوں کا حال ہے۔ ایک تو بدعت ایجاد کرتے ہیں اور پھر جو بھی اس کی مخالفت کرے اسے کافر قرار دیتے ہیں۔ روافض' معتزلہ اور جہمیہ وغیرہ کا

یہی حال ہے۔ جن لوگوں نے خلقِ قرآن کا مسئلہ بنا کر لوگوں کا امتحان لیا تھا وہ ایسے ہی لوگ تھے۔ خود ہی ایک بدعت ایجاد کی اور پھر جس نے اس کی مخالفت کی اسے جھٹ سے کافر قرار دے دیا‘ اور پھر اُسے نہ صرف اس کے حقوق سے محروم کیا بلکہ اسے سزا بھی دلوائی۔

اللہ کے رسول ﷺ جن باتوں کے ساتھ مبعوث ہوئے ہیں‘ ان میں سے کچھ باتیں جن لوگوں پر مخفی رہ جاتی ہیں وہ یا تو عادل ہوں گے یا ظالم۔ ان میں انصاف پسند وہ لوگ ہیں جو انبیاء کرام ﷩ سے منقول آثار پر عمل کرتے ہیں‘ لیکن دوسروں پر ظلم نہیں کرتے‘ اور ان میں ظالم وہ لوگ ہیں جو دوسروں پر زیادتی کرتے ہیں‘ اور یہ لوگ جانتے ہیں کہ وہ ظلم کر رہے ہیں پھر بھی وہ ظلم کرتے رہتے ہیں‘ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: ﴿وَمَا تَفَرَّقَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَاۗءَتْهُمُ الْبَيِّنَةُ ۝۴﴾ (البیّنۃ) ’’اور جن لوگوں کو کتاب دی گئی وہ دلیل آنے کے بعد ہی جدا جدا ہو گئے‘‘۔

لیکن اگر وہ عدل وانصاف کا راستہ اختیار کرتے تو ایک دوسرے کا اقرار کرتے‘ جیسے ائمہ فقہاء کے پیروکار جو یہ جانتے ہیں کہ وہ ان اختلافی مسائل میں بطور خود اللہ اور اُس کے رسول ﷺ کا حکم جاننے سے قاصر ہیں‘ تو انہوں نے اپنے ائمہ کو رسول کے نائب کی حیثیت سے جانا اور کہا کہ ہماری ساری کی ساری پہنچ یہاں تک ہے۔ ان میں سے انصاف پسند لوگ دوسروں پر ظلم وزیادتی نہیں کرتے‘ نہ ہی قول سے اور نہ ہی فعل سے‘ جیسے یوں کہنا کہ میرے امام کا قول ہی صحیح ہے‘ چاہے وہ حجت سے خالی ہو‘ اور اپنے مخالف کی مذمت کرنا‘ حالانکہ وہ اپنا عذر رکھتا ہو۔‘‘(۲)

ابن مفلحؒ اپنی کتاب ’’الفروع‘‘ میں کہتے ہیں:

’’ابن الجوزی نے اپنی کتاب ’’السِرّ المُصون‘‘ میں لکھا ہے کہ میں نے کچھ ایسے لوگوں کو دیکھا جو علم سے انتساب رکھتے ہیں لیکن ان کا طرزِ عمل عوام الناس جیسا ہے۔ اگر کوئی حنبلی‘ شوافع کی مسجد میں نماز پڑھاتے ہوئے ’’بسم اللہ‘‘ بلند آواز سے نہ پڑھے تو شوافع ناراض ہو جاتے ہیں اور اگر ایک شافعی‘ حنابلہ کی مسجد میں نماز پڑھائے اور بسم اللہ بلند آواز سے پڑھے تو حنابلہ ناراض ہو جاتے ہیں‘ حالانکہ یہ ایک خالص اجتہادی مسئلہ ہے اور اس پر اصرار کرنا ہوائے نفس میں داخل ہے کہ جس سے منع کیا گیا ہے۔

ابن عقیل کہتے ہیں: میں نے لوگوں کو دیکھا ہے کہ اگر وہ عاجز نہ ہوں تو ظلم پر اتر آئیں‘ اور میں عوام کی بات نہیں کر رہا بلکہ علماء کا ذکر کر رہا ہوں۔ ابن یوسف کے عہد میں حنابلہ کو کھلی چھٹی تھی‘ چنانچہ وہ فروعی مسائل میں شوافع پر زیادتی کرتے تھے اور شوافع کو قنوت پڑھنے اور بسم اللہ کو جہر سے پڑھنے سے روکتے تھے‘ حالانکہ یہ ایک اجتہادی مسئلہ

تھا‘ اور پھر جب ابن یوسف وفات پا گئے اور نظام کی حکومت آ گئی اور حنابلہ کے دن ہوا ہو گئے تو پھر شوافع ظالم سلاطین کی طرح ان پر چڑھ دوڑے‘ کسی کو پابندِ سلاسل کیا‘ چغلیوں کی بنا پر عوام الناس کو بھی تکلیف پہنچاتے اور فقہاء کو تجسیم کا الزام لگا کر برا بھلا کہتے۔‘‘

پھر وہ کہتے ہیں: ’’میں نے فریقین کے حالات کا بخوبی اندازہ لگانے کے بعد اندازہ لگایا کہ یہ لوگ آدابِ علم سے محروم ہیں‘ ان کے کام ان فوجیوں سے مختلف نہیں جو اپنے دائرہ اختیار میں خوب دھما چوکڑی کرتے ہیں اور جونہی ملازمت سے فارغ ہوتے ہیں‘ مسجدوں میں ڈیرہ جما لیتے ہیں۔‘‘ (آخر کلام ابن الجوزی)(۳)

حواشی

(۱) الفتاویٰ‘ ۹:۱۱۳۰۔ (۲) الفتاوی ٤:٧ (۳) ألفروع و تصحیح الفروع ٣ : ٢٣

ضابطہ نمبر۸:

اعلانیہ مناظرے سے سوائے اشد ضرورت کے اجتناب کرنا

کسی اختلافی بات میں حقیقت جاننے کے لیے باہمی بات چیت ایک درست وسیلہ کی حیثیت رکھتی ہے‘ لیکن اگر یہی بات چیت ایک اعلانیہ مناظرے کی شکل اختیار کر لے تو اکثر دونوں اطراف یا ان میں سے کسی ایک کو اپنے موقف پر اصرار کرنے پر آمادہ کرتی ہے اور مخالف کی دلیل کی صحت کو پرکھنے کے بجائے ہر صورت اس کی تردید پر مجبور کرتی ہے‘ اور اسی لیے اس طرح کے اعلانیہ مناظرے ختم ہو جاتے ہیں لیکن کوئی بھی فریق اپنے مخالف کی بات کو نہیں مانتا‘ بلکہ دونوں میں دوری اور کاٹ پیدا ہو جاتی ہے‘ اختلاف نہ صرف گہرا ہو جاتا ہے بلکہ اس کا دائرہ بھی پھیل جاتا ہے۔ اس لیے بہتر یہی ہے کہ ساتھیوں میں بات چیت ہو لیکن اعلانیہ نہ ہو‘ اِلا یہ کہ کسی ضروری مصلحت کی بنا پر ایسا کیا جائے۔ شوکانیؒ کہتے ہیں:

’’اکثر یہ دیکھا گیا ہے کہ اہل علم میں سے دو انصاف پسند شخص کسی مسئلہ میں غور وخوض کرتے ہیں اور ایک دوسرے کے دلائل کو پرکھتے ہیں اور یہ جاننے کے باوجود کہ حق دوسرے کے ساتھ ہے‘ ایک دوسرے کا حلیہ بگاڑ دیتے ہیں‘ حالانکہ ان کے اپنے دلائل بالکل بے جان اور بے وزن ہوتے ہیں۔ تعصب کی یہ ایسی دقیق قسم ہے جس میں انصاف پسند لوگ بھی مبتلا ہو جاتے ہیں‘ خاص طور پر اگر دوسرے لوگ بھی حاضر ہوں اور

ان کی بات سنتے ہوں۔ بہت کم ایسا ہوتا ہے کہ غلط کار حق کو تسلیم کرنے پر آمادہ ہو جائے۔
ان باتوں کا مشاہدہ اہل علم کے اجتماعات اور درس کی مجالس میں بخوبی کیا جا سکتا ہے۔''(۱)

حواشی

(۱) أدب الطلب، ص ۸۱۔

ضابطہ نمبر۹:

تردید اور تنقید میں حد سے تجاوز نہ کرنا

مخالفین کی تردید شروع اسلام سے لے کر آج تک علماء کے ہاں معروف رہی ہے اور ایسا کرنے میں کوئی قباحت نہیں ہے۔ قباحت ہے تو اس بات میں کہ مخالف کی دھجیاں اڑائی جائیں اور اس سے ایسی ایسی باتیں یا افعال منسوب کیے جائیں جو اُس نے نہ کہے، نہ کیے۔ اخلاقی لحاظ سے یہ چیز انتہائی معیوب ہے، شریعت کی بیشتر نصوص میں اس سے منع کیا گیا ہے۔
نبی مکرم ﷺ ارشاد فرماتے ہیں:

''جس شخص میں چار چیزیں پائی جائیں وہ خالص منافق ہے، اور جس کسی میں ان میں سے ایک خصلت بھی پائی جائے تو اس میں نفاق کی ایک خصلت پائی جائے گی، یہاں تک کہ وہ اسے چھوڑ دے: اگر اسے امانت سپرد کی جائے تو وہ اس میں خیانت کرے، جب وہ بات کرے تو جھوٹ بولے، جب عہد و پیمان کرے تو غداری کرے، اور جب جھگڑا کرے تو اس میں فجور کرے۔''(۱)

یہ جو آخری بات بیان ہوئی تو اس کا مطلب یہ ہے کہ جب کسی سے اختلاف ہو تو اپنی جیت کے لیے مخالف شخص پر زیادتی کرے اور اس سے وہ کچھ منسوب کرے جو اُس نے نہ کہا اور نہ ہی کیا۔ یہی تو منافقین کی نشانی ہے اور اللہ ہمیں ایسی خصلت سے بچائے۔ کچھ لوگ بزعم خود دین کی نصرت کے لیے منافقین کی خصلتوں کو اپنا لیتے ہیں، حالانکہ جھوٹ، خیانت اور فجور سے دین کی مدد نہیں کی جا سکتی، دین تو آیا ہی اس لیے ہے کہ اخلاق اور فضائل اعمال کی بنیادیں رکھے۔ حق ثابت کرنے کے لیے حرام چیزوں کو وسیلہ بنانے کی دین میں کوئی گنجائش نہیں۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:

﴿يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَكُونُوا مَعَ الصَّادِقِينَ ﴿١٩﴾﴾ (التوبة)

''اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور سچ بولنے والوں کا ساتھ دو۔''

نبی اکرم ﷺ ارشاد فرماتے ہیں:

''سچائی اختیار کرو، کیونکہ سچائی نیکی کی طرف راہنمائی کرتی ہے اور نیکی جنت کی طرف لے جاتی ہے۔ ایک آدمی سچ بولتا رہتا ہے اور سچ ہی کا متلاشی رہتا ہے یہاں تک کہ اللہ کے ہاں صدیق لکھا جاتا ہے۔ اور جھوٹ سے بچو، کیونکہ جھوٹ گناہ کی طرف لے جاتا ہے اور گناہ نارِ جہنم کی طرف، اور ایک شخص جھوٹ بولتا رہتا ہے اور جھوٹ کا متلاشی رہتا ہے یہاں تک کہ اللہ کے ہاں جھوٹا لکھا جاتا ہے۔''(۲)

جھگڑے میں فجور (یعنی گناہ کا ارتکاب) زیادتی اور سرکشی ہے، اور اس بات سے کو فرق نہیں پڑتا کہ یہ شخص اپنے خیال کے مطابق دین کی حمایت کرنے چلا ہو یا یہ سمجھتا ہو کہ مخالف کو کمزور کرنے کے لیے اس کی حجت کا توڑ کرنا ضروری ہے۔ امت کے مابین اکثر اختلافات اسی نوع کے ہیں۔ ابن تیمیہ رحمہ اللہ ارشاد فرماتے ہیں:

''اگر آپ امت کے علماء، عبادت گزار اشخاص، اُمراء اور رؤساء کے مابین واقع ہونے والے اختلافات کو بغور دیکھیں تو اس کو اسی قسم کا پائیں گے، یعنی زیادتی چاہے تاویل کے ساتھ ہو یا بغیر تاویل کے، جیسے جہمی فرقے نے صفاتِ الٰہی اور قرآن کے مسئلہ میں اہلِ سنت پر زیادتی کی اور جیسے ناصبی حضرات نے حضرت علی رضی اللہ عنہ اور اہلِ بیت پر کی، اور جیسے اللہ سے تشبیہ دینے والے تشبیہ کا انکار کرنے والوں پر کرتے ہیں، یا جیسے بعض اہلِ سنت اپنے ہی حضرات پر یا بعض اہل بدعت پر اس طرح زیادتی کرتے ہیں کہ جو کچھ اللہ نے حکم دیا ہے اس سے زیادہ کہہ جاتے ہیں۔''(۳)

القرافیؒ مخالفین کی تردید کرنے کی شرط بتاتے ہوئے کہتے ہیں:

''مخالفین میں جو بری باتیں پائی جاتی ہیں انہیں حقیقت کے مطابق ہی بیان کرے، ان سے وہ فواحش اور منکرات منسوب نہ کرے جن کے وہ مرتکب نہیں ہوئے، ایک بدعتی کے بارے میں یہ نہ کہے کہ وہ شراب پیتا ہے، یا زنا کاری کرتا ہے یا کوئی دوسرا ایسا الزام لگائے جو اس میں نہ پایا جاتا ہو۔''(۴)

حواشی

(۱) بخاری (۳٤) مسلم (۲۱۹)
(۲) مسلم (٦٨/٥)
(۳) الفتاوی ۱٤: ٤٨٢۔٤٨٣۔
(۴) الفروق ٤:٢٠٧۔٢٠٨

❀❀❀

حِمار بطور ایک تہذیبی علامت

محمد عمران خان ☆

انسانی شعور کی یہ ایک نمایاں صفت ہے کہ وہ کسی بھی خیال، تصور، کیفیت اور شے کو کسی علامت سے جوڑ کر اس کے مخصوص معنی متعین کرسکتا ہے اور اس علامت کو اصل کی جگہ پر رکھ کر اس کے مطابق اپنے رویہ و کردار اور عمل کو ڈھال سکتا ہے۔ یہ کام انسان شعوری سطح پر یعنی ارادتاً بھی کرسکتا ہے اور لاشعوری (unconsciously) طور پر کوئی دوسرا بھی اس کی مرضی و منشا کے بغیر یہ کام سرانجام دے سکتا ہے۔ اس process of association کو conditioning کہا جاسکتا ہے۔ ہر انسانی معاشرہ مختلف النوع علامات کا استعمال کر کے اپنی تاریخ، ثقافت، علمیت اور ماحول کو ظاہر کرتا ہے۔ علامتی اظہار (symbolism) کی ایک صفت یہ بھی ہے کہ یہ بنا الفاظ و گفتگو یا مکالمہ کے، استعارتاً و کنایتاً اپنا مطلب و مدعا نہ صرف پہنچا دیتے ہیں بلکہ اپنے مخاطبین پر خاطر خواہ اثر بھی قائم کرتے ہیں۔

علامات کا استعمال ورائٹی مہیا کرتا ہے اور وسیع الجہت تشریحات و توضیحات کی راہیں کھولتا ہے۔ یہ علامات، اشکال و اجسام، جمادات و حیوانات، شجر و حجر، مظاہرِ فطرت و کائنات، رنگوں، غرض بے شمار چیزوں اور تصورات پر مبنی ہوسکتی ہیں۔ مثلاً رنگوں کی بات کی جائے تو کالا رنگ موت، برائی یا اندھیرے کو ظاہر کرتا ہے جبکہ سفید رنگ سے زندگی اور پاکی و صفائی کا اظہار ہوتا ہے۔ سرخ رنگ اگر خون، جذباتیت، خطرہ اور بداخلاقی کے لیے رمز ہے تو نیلا رنگ امن، سکون و سلامتی کی علامت ہے۔ جانوروں میں شیر خوف اور طاقت کی جبکہ گیدڑ بزدلی و ڈرپوکی کی علامت ہے۔ شاہین عالی ہمتی و بلند ارادوں کا سمبل ہے تو فاختہ امن کی اور کبوتر پیغام رسانی کی علامت ہے۔ انسانی جذبات میں مسکراہٹ محبت و دوستی کی علامت ہے تو پیشانی پر سلوٹیں غصہ، ناراضگی اور ناپسندیدگی کا استعارہ ہے۔ اسی طرح زنجیر دو چیزوں کو باہم منسلک کرنے کا اشارہ ہے۔ طلوعِ سحر نئے آغاز کو ظاہر کرتی ہے۔ کھوپڑی خطرہ اور موت کی علامت

☆ imrann2010@gmail.com

ہے۔ اسی طرح ہمارے اردگرد بے شمار علامات اور اشارات ہمہ وقت موجود ہوتے ہیں، اور ہم دانستہ و نادانستہ انہیں اپنی روزمرہ زندگی میں مخصوص معانی دے کر مسلسل بَرت رہے ہوتے ہیں۔

جہاں کچھ اشیاء یا علامات ایسی ہیں جن کے معانی و مطالب ہر جگہ مشابہ ہوتے ہیں تو دوسری طرف دو مختلف تہذیبوں میں ایسی اشیاء یا تصور بھی ہوتے ہیں کہ ان کی ''علامت'' تو ایک ہی ہوتی ہے لیکن اس کے معنی میں بہت فرق یا تضاد پایا جاتا ہے۔ مثلاً اردو محاورہ میں ''اُلّو'' بے وقوفی و ناسمجھی کا استعارہ ہے جبکہ مغربی معاشرہ میں اس سے ذہانت و سمجھ داری اور راز و اسرار وابستہ ہے۔ اسی طرح یہ بھی ممکن ہے کہ ایک چیز کسی معاشرے میں امتیازیت رکھتی ہو جبکہ دوسرے سماج میں اسے وہ مقام و منزلت حاصل نہ ہو۔ جیسے ''حمار'' (donkey) مغربی یا اہلِ کتاب (یہود و نصاریٰ) کی تاریخ و علمیت میں مثبت و نمایاں اوصاف و کمال کا حامل رہا ہے، جبکہ اس کے برعکس عربی و اسلامی اور مشرقی معاشروں میں حمار (گدھے) کو منفی و پست ہمتی جیسے اوصاف کا حامل مانا جاتا ہے اور حمار سے جاہل اور بے علم آدمی بھی مراد لیا جاتا ہے۔ اسلامی تاریخ و علمیت میں حِمار کی بجائے حِصان (گھوڑے) کو مرکزیت حاصل ہے۔

حمار یا گدھا سماجی سطح پر ہزاروں سال سے انسان کے لیے بار بَرداری (beast of burden) اور سواری کے کام آتا رہا ہے۔ آج بھی ترقی پذیر ممالک اور اس کے دیہاتوں میں یہ کارآمد جانور تصور کیا جاتا ہے۔ گدھے اور گھوڑے کی نعل کو مشرقی معاشرے میں نیک شگون اور جادو ٹونہ کے توڑ کے طور پر بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ لسانی و ادبی سطح پر اگر جائزہ لیا جائے تو گدھے کو عربی زبان میں حمار، انگریزی میں donkey/ass، فارسی میں خَر اور عبرانی میں اموریا حمور کہا جاتا ہے۔ مشرقی معاشرہ میں ''اوگدھے'' اور ''نرا گدھا'' جیسی تراکیب عام بول چال میں استعمال ہوتی ہیں۔ اسی طرح محاورہ مشہور ہے: ''گدھا کیا جانے زعفران کی قدر'' جس سے مراد یہ لی جاتی ہے کہ گدھا ایسا بیوقوف جانور ہے جو جاہ و منصب کی قدر نہیں جانتا۔ ایک اور محاورہ ہے ''گدھے کے سر سے سینگ کی طرح غائب ہوجانا'' یعنی کسی شے یا تصور کا یک دم غائب ہوجانا۔ فارسی میں ''خَرِ دجّال'' اور ''خَرِ عیسیٰ اگر بمکہ رود، چوں باز آید ہنوز خر باشد'' (حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا گدھا مکہ سے بھی ہو آئے تو اس کی صورت اور سیرت نہیں بدلے گی) جیسے محاورے مستعمل ہیں۔ اقبال کے بقول: ع ''کہ از مغزِ دو صد خرفکرِ انسانے نمی آید'' (دو سو

گدھوں کے دماغ مل کر بھی ایک انسان کی عقل کے برابر سوچ نہیں سکتے۔)

جدید مغربی ادب کے نمائندہ' انگلش ڈرامہ نگار شیکسپیئر نے اپنے ڈراموں میں گدھے کی اصطلاح احمق و بیوقوف شخص کے لیے استعمال کی۔ اسی طرح برطانوی ناولسٹ جارج آرویل نے بھی گدھے کو اپنے مشہور ناول ''Animal Farm'' (۱۹۵۱ء) میں اسی پیرائے میں استعمال کیا ہے۔ غرض دنیائے ادب میں گدھے کی اصطلاح عموماً بیوقوف' نالائق' گاؤدی اور نادان کے لیے استعمال کی جاتی ہے۔ حیاتیاتی طور پر ''گدھا'' گھوڑے کے خاندان ایکویڈے کا رکن ہے۔ براعظم ایشیا اور افریقہ میں دیگر خطوں کی بہ نسبت گدھے زیادہ ہیں' جبکہ چین' پاکستان' ایتھوپیا اور میکسیکو وہ ممالک ہیں جہاں یہ بڑی تعداد میں پائے جاتے ہیں۔ یاد رہے یہاں محاورتاً بولے جانے والے گدھے نہیں بلکہ اصلی گدھے مراد ہیں!

گدھے کی اگر تہذیبی و مذہبی شناخت کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ مصری تہذیب میں گدھا' خدائے شمس (Sun-God) 'را' کی علامت تھا' جبکہ ہندوازم میں دُرگا دیوی (نووا دُرگا) کی ایک شکل ''کالارتری'' کی سواری مانا جاتا ہے۔ قدیم یونانی کہانی نویس ایسوپ (۵۶۴ ق م) کی لوک داستانوں میں سے ایک ''شیر کی کھال میں گدھا'' بہت مقبول ہے۔ یہودی وعیسائی روایات (Judo-Christian) میں بھی حامور یا گدھے کا بارہا ذکر ملتا ہے۔ بائبل میں ڈیڑھ سو سے زائد مقامات پر گدھے کا ذکر آیا ہے۔ اہل کتاب کی مذہبی روایات کے مطابق گدھا گھوڑے سے زیادہ ثابت قدم تصور کیا جاتا تھا۔

پرانے عہد نامہ (Old Testament) میں کسی شخص کی دولت و ثروت کا اندازہ گدھوں کی تعداد سے لگایا جاتا تھا (پیدائش ۳۰:۴۳)۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس بھی کئی گدھے تھے (پیدائش ۲۴:۳۵)۔ درحقیقت گدھے کی سواری ایک شاہی سواری تصور کی جاتی تھی: ''اے بنت صیون (Zion) تو نہایت شادمان ہو۔ اے دختر یروشلم خوب للکار کیونکہ دیکھ تیرا بادشاہ تیرے پاس آتا ہے۔ وہ صادق ہے اور نجات اس کے ہاتھ میں ہے۔ وہ حلیم ہے اور گدھے پر بلکہ جوان گدھے پر سوار ہے'' (زکریا ۹:۹)۔ یہودی روایات یعنی عہد نامہ قدیم کی پیشین گوئیوں کے مطابق ان کا مسیحا (دجال Antichrist) گدھے پر سوار آئے گا' جبکہ عیسائی روایات (انجیل) کے مطابق یہ عیسیٰ علیہ السلام یسوع مسیح تھے جو گدھے پر سوار یروشلم میں داخل ہوئے

(متی ۲۱:۴۔۷' یوحنا ۱۲:۱۴۔۱۵)۔ عیسائی ایسٹر کے تہوار سے قبل ''Palm Sunday'' مسیح کی یروشلم میں فاتحانہ آمد کی خوشی میں مناتے ہیں۔ عیسائیوں میں گدھے کی سواری گھوڑے سے اس وجہ سے بھی افضل خیال کی جاتی تھی کیونکہ گھوڑے جنگ کے لیے مخصوص تھے۔

عہدِ قدیم میں گھوڑے کا تعلق جنگ اور طاقت سے جبکہ گدھے کا صلح اور حلیمی سے کیا جاتا تھا۔ تاہم اس سے یہ خیال نہ کیا جانا چاہیے کہ یہود و نصاریٰ بہت صلح جو اور امن پسند قومیں ہیں۔ ایسا ہرگز نہیں ہے۔ پاپائیت (کیتھولک عیسائیت) کے مسیحی بدعتی فرقوں اور سائنسدانوں کے خلاف دل دہلا دینے والے مظالم' مسلمانوں کے خلاف وحشیانہ صلیبی جنگیں' یورپین خانہ جنگیاں و خونی انقلابات' پرفریب استعماری تاریخ' عربوں کے قلب میں یہودی ریاست اسرائیل کا قیام' خونریز عالمی جنگیں اور نائن الیون کے بعد اُمتِ مسلمہ کی نظریاتی و جغرافیائی سرحدوں کے خلاف سازشوں اور جنگوں کا لامتناہی سلسلہ ان کی جارحانہ و بے رحمانہ طرزِ عمل کی تاریخی شہادتیں ہیں۔ مستشرقہ کیرم آرم اسٹرانگ یہودیوں کے یہووا کو ''خدائے جنگ'' قرار دیتی ہے۔

یہ بات باعثِ دلچسپی ہے کہ یہودیوں کے ہاں گدھا حرام ہے۔ اسی طرح اسلام میں بھی پالتو گدھا حرام ہے' لیکن قربِ قیامت میں یہودی مسیحا (نجات دہندہ Savior) اس حرام جانور پر سوار ہو کر آئے گا۔ یہ بات بھی دلچسپ ہے کہ یہودیوں کے بارے میں یہ کہا جاتا رہا ہے کہ وہ اپنے عبادت خانے (سینیگاگ) میں ''گدھا خدا'' کی عبادت کیا کرتے تھے اور یہ کہ پیغمبر موسیٰ علیہ السلام گدھے پر سوار ہیں' اور بعض عبادت خانوں میں صرف گدھے کا سر بطورِ عبادت کے استعمال کیا جاتا تھا' جسے گدھے کی پوجا (onolatry) کہا جاتا ہے۔ بعض اسے یہود کی بچھڑے کی پوجا calf worship (پرستش گاؤ سالہ) سے بھی جوڑتے ہیں۔ بچھڑے کی پوجا کا ذکر قرآن مجید میں بھی کئی مقامات پر کیا گیا ہے' مثلاً فرمایا گیا: ''جب موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم سے کہا کہ اے میری قوم! بچھڑے کو معبود بنا کر تم نے اپنی جانوں پر ظلم کیا ہے۔'' (البقرۃ:۵۴) ''پھر تم نے بچھڑے کو معبود بنا لیا اس کے بعد کہ تمہارے پاس کھلی نشانیاں آ چکی تھیں۔'' (النساء:۱۵۳)۔

یہودی روایات کے مطابق یہود کی پہلی ریاست کے دارالحکومت سکم (Schechem) (نابلس' اسرائیل) کا شہزادہ حمور (گدھا) تھا (عہد عتیق پیدائش' باب ۳۴)۔ یہودی روایات

میں ''مسیحا کا گدھا'' (Messiah's Donkey) وہ گدھا ہے جس پر یہودی نجات دہندہ (Son of David or Messiah ben David) دنیا کے آخری اوقات میں ظاہر ہوگا۔ یاد رہے کہ المَلحَمة العُظمٰی یاالملحمة الکُبریٰ (Armageddon) یا آخری زمانہ کی عظیم ترین جنگوں کے بارے میں احادیثِ ملاحم میں دجال کی سواری ''مخصوص گدھا'' ہی بیان کی گئی ہے۔ مفتی ابولبابہ شاہ منصور نے اسرائیلی ایجاد کردہ طیارہ Heron کو گدھے سے مشابہت کی بنا پر دجال کی سواری قرار دیا' جبکہ محمد زکی الدین کی تحقیق کے مطابق صحیح حدیث میں بیان کردہ جگہ ''لد'' (Lydda) فلسطین میں اسرائیلی ریاست کے دارالسلطنت تل ابیب سے چند میل کے فاصلہ پر ہے' وہاں اب لد ہوائی اڈہ (بن گوریان ائیر پورٹ) قائم ہے۔ یاد رہے جدید عبرانی زبان میں ''مسیحا کا گدھا'' کی اصطلاح ایسے بُرے فعل کے لیے مستعمل ہے جو کسی دوسرے کے کہنے پر کیا گیا ہو۔

یہاں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ذرا ٹھہر کر ایک سرسری نظر دجال کی شناخت و اعمالِ شنیعہ پر ڈال لی جائے۔ حضور ختم الرسل ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''پیدائش آدم سے لے کر قیامت تک کوئی فتنہ دجال سے بڑا نہیں۔'' (صحیح مسلم)۔ شیخ محمد کمال مشکاۃ اس کی وضاحت یوں کرتے ہیں: عیسائی صحیفہ انجیل (Gospel) میں اگرچہ دجال (Antichrist' یہودی مسیحا) کا ذکر موجود ہے اور اسے وحشی یا حیوان (Beast) کہا گیا اور اس کا عدد ۶۶۶ بھی بتایا گیا ہے (یوحنا عارف کا مکاشفہ Revelation ۱۳:۱۸)۔ لیکن یہ بہت مختصر' غیر واضح اور مبہم علاماتِ دجال ہیں۔ اس کے بالمقابل پیغمبر صادق محمدؐ رسول اللہ ﷺ نے قربِ قیامت اور دجال کی بہت سی نشانیوں کا تذکرہ فرمایا ہے۔ دجال دَجَل سے مشتق ہے جس کے معنی دھوکہ دینا' فریب دینا' غیر کی شخصیت اختیار کرنا وغیرہ ہے۔ دجال دراصل ''المسیح الدّجّال'' کا اختصار ہے یعنی جھوٹا مسیح۔ دجال سے مراد وہ شخص ہے جو مسیحِ حق ہونے کا دعویٰ کرے یا ان کی شخصیت کا روپ دھار لے اور زبانِ حال یا زبانِ مقال سے دعویٰ کرے کہ وہی مسیحِ حق ہے۔ شیخ موصوف کے مطابق آخری زمانے کے تین بڑے دجال ہیں: (۱) پہلا دجال وہ ہوگا جو مسیحِ حق عیسیٰ علیہ السلام کے تمام معجزاتِ روحانیہ کی نقل غیر روحانی (خصوصاً) مادی وسائل سے کرے گا سوائے احیاء الموتیٰ (مردہ کو زندہ کرنا) کے۔ یہ ''دجالِ علوم یا دجالِ اصغر'' ہے۔ (۲) دوسرا دجال ''دجالِ مسلم'' وہ دجال ہے جو مسلم

ملک (اصفہان/خراسان) سے خروج کرے گا' وہ طوافِ کعبہ بھی کرے گا اور مضافاتِ مدینہ تک پہنچ جائے گا اور وہاں صرف ایک بار ایک شخص کو قتل کر کے زندہ کرنے پر قادر ہوگا لیکن دوبارہ ایسا نہ کر سکے گا اور خدائی کا دعویٰ دار ہوگا' وہ سیدھی آنکھ سے کانا ہوگا۔ (۳) تیسرا دجال سب سے آخر میں ''دجالِ اسرائیلی یعنی دجالِ اکبر'' خروج کرے گا (بعد فتحِ روما) اور یہ قرناء شیاطین کی مدد سے بار بار لوگوں کو زندہ کرے گا۔ یہ دجال حرمین (مکہ و مدینہ اور مضافات کا علاقہ) میں قطعاً داخل نہ ہو سکے گا اور بائیں آنکھ سے کانا ہوگا۔

قرآن' احکامِ تورات کے بارے میں یہودی طرزِ عمل کو حمار سے تشبیہ دیتے ہوئے کہتا ہے:

﴿مَثَلُ الَّذِيْنَ حُمِّلُوا التَّوْرٰىةَ ثُمَّ لَمْ يَحْمِلُوْهَا كَمَثَلِ الْحِمَارِ يَحْمِلُ اَسْفَارًا ؕ بِئْسَ مَثَلُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ۝۵﴾

(الجمعة)

''جن لوگوں کو تورات پر عمل کرنے کا حکم دیا گیا پھر انہوں نے اس پر عمل نہیں کیا' ان کی مثال اس گدھے کی سی ہے جو بہت سی کتابیں لادے ہو۔ اللہ کی باتوں کو جھٹلانے والوں کی بہت بُری مثال ہے۔ اور اللہ (ایسی) ظالم قوم کو ہدایت نہیں دیتا۔''

قرآن حکیم جنگلی گدھوں کی صفت بیان کرتے ہوئے کہتا ہے:

﴿كَاَنَّهُمْ حُمُرٌ مُّسْتَنْفِرَةٌ ۝۵۰ فَرَّتْ مِنْ قَسْوَرَةٍ ۝۵۱﴾ (المدثر)

''گویا کہ وہ بدکے ہوئے گدھے ہوں' جو شیر سے بھاگے ہوں۔''

یہ ایک عربی محاورہ ہے۔ جنگلی گدھوں کا یہ خاصہ ہوتا ہے کہ خطرہ بھانپتے ہی وہ اس قدر بدحواس ہو کر بھاگتے ہیں کہ کوئی دوسرا جانور اس طرح نہیں بھاگتا۔ اس لیے اہلِ عرب غیر معمولی طور پر بدحواس ہو کر بھاگنے والے شخص کو ان جنگلی گدھوں سے تشبیہ دیتے ہیں جو شیر کی بو یا شکاری کی آہٹ پاتے ہی بھاگ پڑے ہوں (تفہیم القرآن)۔ قرآن گدھے کی آواز کو کرخت قرار دیتا ہے (لقمان:۱۹)۔ یاد رہے! گدھے کا بلند آواز میں رینکنا (bray) تقریباً ۲۰ سیکنڈ تک رہتا ہے اور تقریباً تین کلومیٹر کی دوری تک سنا جا سکتا ہے۔

نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''جب تم مرغ کی آواز سنو تو اللہ تعالیٰ سے اس کا فضل طلب کرو' کیونکہ اس نے فرشتے کو دیکھا ہے۔ اور جب گدھے کی آواز سنو تو اللہ تعالیٰ کے ذریعے سے

شیطان کی پناہ مانگو‘ کیونکہ اس نے شیطان کو دیکھا ہے۔‘‘ (بخاری)

سورۃ البقرۃ:۲۵۹ میں حضرت عزیر علیہ السلام کے گدھے کا ذکر آیا ہے۔

عرب جاہلی و مذہبی روایات وادبیات میں گھوڑے کا ذکر بار ہا ہوا ہے اور اس کے بے شمار نام ہیں‘ مثلاً الخیل‘ الفرس‘ حصان وغیرہ۔ عرب شرفاء وفضلاء گھوڑے کی نسل اور نسب تک یاد رکھا کرتے تھے۔ عربی النسل گھوڑے دنیا میں اپنا ایک خاص مقام رکھتے ہیں۔ اصمعی کی کتاب ’’گھوڑوں کے متعلق شافی جواب‘‘ اور ابن ہذیل اندلسی کی ’’حلیۃ الفرسان‘‘ معروف ہیں۔ غسانی کی کتاب گھوڑوں کے متعلق مکمل انسائیکلو پیڈیا ہے۔ اس کے علاوہ صاحبی‘ نمیری اندلسی‘ دمیاطی اور حال ہی میں سعودی عرب کے تاریخ دان حمد الجاسر نے بھی گھوڑوں کی انواع واقسام‘ نسلیں اور دیگر مختلف امور پر کتابیں تحریر کی ہیں۔ قرآن مجید میں گھوڑوں کا ذکرِ خیر موجود ہے‘ مثلاً سورۃ الانفال:۶۰‘ سورۃ النحل:۸ اور سورۃ العادیات میں۔ پیغمبر عربی ﷺ نے فرمایا: ((**الخَیلُ معقُودٌ فِی نَواصِیها الخیرُ اِلٰی یَوم القِیَامَة**)) (متفق علیہ) ’’اللہ تعالیٰ نے قیامت تک کے لیے گھوڑوں کی پیشانیوں میں خیر رکھ دیا ہے‘‘۔ آپ ﷺ کے زیر استعمال بھی کئی گھوڑے تھے۔

مغربی ثقافت (Western Culture) میں گدھا ایک اونچے مقام کا حامل حیوان تصور کیا جاتا ہے جو کہ بائبل اور قدیم یونان سے مغربی تہذیب کا حصہ بن چکا ہے۔ یاد رہے امریکہ میں دو بڑی سیاسی جماعتیں حکومت واقتدار کی رسہ کشی میں حصہ لیتی ہیں‘ ایک ری پبلکن پارٹی اور دوسری ڈیموکریٹک پارٹی۔ جن کے انتخابی نشان بالترتیب ہاتھی (elephant) اور گدھا (donkey) ہیں۔ ڈیموکریٹک پارٹی (گدھا) نہ صرف امریکہ کی بلکہ دنیا کی سب سے پرانی پولیٹیکل پارٹی تصور کی جاتی ہے جس کا آغاز ۱۷۹۲ء میں ٹامس جیفرسن (Thomas Jefferson م ۱۸۲۶ء) نے کیا۔ یہ تیسرا امریکی صدر ہے جو امریکہ کا فاؤنڈنگ فادر‘ پہلا امریکی سیکریٹری آف اسٹیٹ‘ دوسرا وائس پریزیڈنٹ اور امریکی اعلانِ آزادی (Declaration of Independence) کا تحریر کنندہ بھی ہے۔ ڈیموکریٹس نے اپنی سیاسی جماعت کے لیے گدھے کی انتخابی علامت ۱۴ جنوری ۱۸۷۰ء کو استعمال کرنا شروع کی۔ بعد ازاں ۱۸۷۴ء میں کارٹونسٹ ٹامس ناسٹ (Thomas Nast) نے سب سے پہلے ان امریکی سیاسی پارٹیوں کے لیے ہاتھی بمقابلہ گدھا (donkey and elephant)

کی علامات ہارپر میگزین میں پیش کی تھیں۔ ناسٹ کو Father of American Cartoon کہا جاتا ہے۔

اسی طرح کھیل کے میدانوں میں بھی گدھا امریکی فکر کی نمائندگی کرتا نظر آتا ہے۔ Donkey Basketball وہ کھیل ہے جس میں کھلاڑی گدھے پر سوار ہو کر باسکٹ بال کھیلتے ہیں۔ یہ کھیل امریکی پبلک اسکولز میں ۱۹۳۰ء سے جاری ہے۔

برطانیہ میں دنیا کی سب سے بڑی تحفظِ حیوانات کی خیراتی تنظیم قائم ہے جس کا نام ’’تحفظِ گدھا‘‘ (The Donkey Sanctuary) ہے۔ یہ ادارہ ساری دنیا میں گدھوں‘ گھوڑوں اور زیبروں (Equidae Family) کے تحفظ و بقا کے کاموں میں مصروفِ عمل ہے۔ کئی مغربی ممالک میں گدھوں کی سالانہ ریس کا بھی انعقاد کیا جاتا ہے۔ مغربی تہذیب کی نقالی میں کئی مشرقی معاشروں مثلاً پاکستان ومصر وغیرہ میں بھی ایسی ’گدھا دوڑ‘ کا انعقاد کیا جانے لگا ہے۔ حال ہی میں (۱۳ اکتوبر ۲۰۱۸ء) جیو فلمز نے پاکستان کی پہلی کمپیوٹرائزڈ اینی میٹڈ فلم The Donkey King (ڈنکی راجہ) ریلیز کی ہے۔ اس فلم کو بہت زیادہ ایڈورٹائز اور پبلی سائز کیا گیا اور اس کا ایک گانا بار بار نشر کیا جاتا رہا ہے۔ راجپوت برادری نے اس فلم اور اس کے گانے کے خلاف ہتک عزت کے تحت اسلام آباد ہائی کورٹ میں درخواست بھی دائر کی ہے (گلف نیوز‘ ۱۶/ اکتوبر ۲۰۱۸ء)۔

اس تحریر کا حاصل کلام یہی ہے کہ ہر تہذیب اپنا ایک الگ ورلڈ ویو یا تصورِ حیات ومَعاد رکھتی ہے‘ اور اسی سے اس کی علمیت وتاریخ‘ ثقافت‘ تمدن اور طرزِ زندگی اُبھرتے ہیں اور علامتی نظام (symbolism structure) بھی مرتب ہوتا ہے۔ اگر غالب تہذیب کے ان علامتی اظہاریوں کو بلا سوچے سمجھے اپنانا یا اختیار کرنا شروع کر دیا جائے تو ان علامتوں کو قبول کرنے والی معاشرت اور تہذیب جلد یا بدیر اپنی امتیازی علامات واشارات اور ان کا فہم ترک کر کے غالب تہذیب کے علاماتی سانچوں میں خود کو ڈھالنے لگتی ہے۔ اُن کے ہیرو اِن کے بھی ماڈل وسلیبریٹی بننے لگتے ہیں۔ غالب تہذیب کی کمزوریاں اور قباحتیں یا تو نظروں سے بالکل ہی غائب ہو جاتی ہیں یا بے معنی ہونے لگتی ہیں اور انسان غیر ارادی طور پر ان میں رنگ کرانہی کا ہم رنگ بن جاتا ہے۔ مغربی تہذیب کے ثقافتی وتمدنی آثار وعلامات کو اپنی تہذیب میں سمونا تہذیبی خودکشی کے مترادف ہے۔

❁❁❁

حاجی عبدالواحد صاحبؒ کی یادداشتیں (۱۷)

مرتب: پروفیسر حافظ قاسم رضوان

☆

مولانا محمد منظور نعمانیؒ اور ابا جی

مولانا محمد منظور نعمانیؒ، سید ابوالحسن علی ندوی (علی میاں) اور ابا جی کا باہمی تعلق اتنا گہرا تھا کہ حلقۂ احباب میں انہیں 'ارواحِ ثلاثہ' کے نام سے یاد کیا جاتا تھا۔ تینوں بزرگوں نے مشترکہ طور پر دینی ذمہ داریاں ادا کرنے کے لیے ایک دینی جماعت کے نظم سے پہلے ۱۹۳۹ء میں اپنے ذوق کے مختلف دینی مراکز میں حاضری کا پروگرام تشکیل دیا، تاکہ اگر کہیں شرحِ صدر ہو جائے تو پھر وہیں منسلک ہو جائیں۔ نتیجتاً مولانا محمد الیاسؒ، بانی تبلیغی جماعت اور حضرت شاہ عبدالقادر رائے پوریؒ پر یہ تینوں مضطرب روحیں فدا ہو گئیں۔ مولانا نعمانی کے مختصر احوالِ حیات درج ذیل ہیں:

آپ کی پیدائش ۱۸/ شوال ۱۳۲۳ھ مطابق ۱۶/ دسمبر ۱۹۰۵ء کو صوفی احمد حسین صاحب کے ہاں محلّہ دیپا سرائے، سنبھل (ضلع مراد آباد) میں ہوئی۔ والد صاحب کے چھ بیٹے اور تین بیٹیاں ہوئیں، جن میں مولانا نعمانی کا چوتھا نمبر تھا۔ ابتدائی تعلیم آبائی شہر کی مختلف درسگاہوں میں ہوئی، اساتذہ میں مفتی محمد نعیم لدھیانوی کا نام نمایاں ہے۔ بعد میں آپ کو سنبھل کے مشہور عالم حضرت مولانا کریم بخش کے ساتھ دہلی کے مدرسہ عبدالرب میں بھیج دیا گیا۔ اسی مدرسہ میں ۱۳۳۸ھ کے اواخر میں ایک موقع پر حضرت شیخ الہند کی آمد پر مولانا نعمانی نے ان کی زیارت بھی کی۔ یہاں سے مولانا موصوف صدر مدرس کی حیثیت سے دارالعلوم مئو (ضلع اعظم گڑھ) تشریف لے گئے اور آپ کی زیرِ سرپرستی تین سال مولانا نعمانی نے وہاں گزارے۔ بعد میں حضرت مولانا کریم بخش، سنبھل کے ہی ایک مدرسہ میں صدر مدرّس ہو گئے، تو مولانا نعمانی نے

ایک سال وہاں ان کی شاگردی میں گزارا۔ اس کے بعد والد صاحب نے درسِ نظامی کی تکمیل کے لیے آپ کو ۱۳۴۳ھ میں دارالعلوم دیوبند بھیج دیا۔ یہاں دو سال کی تعلیم کے بعد ۱۳۴۵ھ میں مولانا نعمانی نے سندِ فراغت حاصل کی۔ دیوبند میں آپ کو شیخ الحدیث حضرت علامہ انور شاہ کشمیریؒ، حضرت مولانا سید اصغر حسین میاں صاحبؒ، حضرت مولانا شبیر احمد عثمانیؒ اور حضرت مولانا رسول خاں ہزارویؒ جیسی نابغۂ روزگار ہستیوں سے تحصیلِ علم کی سعادت بھی حاصل ہوئی۔ فراغت کے موقع پر مولانا نعمانی کو حضرت علامہ انور شاہ کشمیریؒ سے بیعت کی سعادت بھی حاصل ہوئی۔

اس کے بعد آپ نے تدریس کا آغاز شوال ۱۳۴۵ھ مطابق ۱۹۲۷ء میں سنبھل میں اپنے محلّہ کے مدرسہ محمدیہ سے فرمایا (آپ کی تعلیم کی ابتدا بھی یہیں سے ہوئی تھی)۔ ایک سال کے بعد آپ امروہہ (ضلع مراد آباد) کے مدرسہ (اسلامیہ) چلہ میں تشریف لے گئے اور تین سال وہاں تدریسی خدمات سرانجام دیں۔ اس دوران مناظرانہ ذوق جو تدرس و تدریس کے ساتھ طبیعت کا حصہ تھا، زیادہ بڑھ گیا۔ ذہن اس 'مناظرہ کی دھت' میں پوری طرح ملوث ہو گیا اور آئے دن آریہ سماج (شدھی، شنگھٹن) قادیانیوں (مرزائیوں) اور زیادہ تر اہلِ بدعت سے کامیاب مناظرانہ معرکہ آرائی ہونے لگی۔ حنفی ہونے کی حیثیت سے اپنے نام کے ساتھ امام ابوحنیفہؒ (نعمان بن ثابت) کی نسبت سے نعمانی کا لاحقہ بھی اسی دور کی یادگار ہے۔ اسی مناظرانہ ذوق وشوق کے پیشِ نظر مولانا محمد منظور نعمانی نے تقریری کے ساتھ تحریری خدمات بھی ادا کرنے کے لیے محرم ۱۳۵۳ھ مطابق مئی ۱۹۳۴ء میں ماہنامہ 'الفرقان' کا اجراء کیا۔ اس میں ''دینِ الٰہی کی اشاعت اور توحید وسنت کی حمایت وحفاظت'' کا مقصد پیشِ نظر رکھا گیا۔ اس کے ساتھ اس میں آپ نے باطل مذاہب اور گمراہ فرقوں کے خلاف اپنا تحریری جہاد جاری رکھا۔ انہی ایام میں الفرقان کے دو علیحدہ خصوصی نمبر حضرت مجدد الف ثانیؒ اور حضرت شاہ ولی اللہؒ کے حوالے سے مشہور ومعروف ہوئے، اہلِ علم کے ہاں انہیں خصوصی قبولیت اور تحسین حاصل ہوئی۔ بعد میں آپ نے 'الفرقان' کو کلیتاً دعوت وتبلیغ کے لیے وقف کر دیا۔

آزادی کی منزل قریب نظر آنے پر برصغیر میں مسلمانوں کے دینی اور سیاسی مستقبل پر بھی مختلف اطراف سے سوال اٹھنے لگے۔ اس دوران سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ نے اپنے ماہنامہ

'ترجمان القرآن' میں جب ان موضوعات پر بحث ومباحثہ کا دروازہ کھولا تو اندریں حالات مولانا نعمانی کی بھی ان تحریروں میں دلچسپی پیدا ہوئی' نتیجتاً مولانا مودودی سے آپ کا قرب بڑھنے لگا۔ اگرچہ پہلے آپ جمعیت علمائے ہند کے موقف کو صحیح سمجھتے اور اس کے باقاعدہ رکن تھے' لیکن اب احیائے دین کی دعوت اور اس کے لیے ایک امیر کی اطاعت میں باقاعدہ منظّم جدوجہد کی فکر نے مولانا نعمانی کو بے چین کر دیا۔ اسی بنا پر جب سید مودودی نے 'جماعت اسلامی' کی دعوت پیش کی اور اس کی تشکیل کے لیے ۲۶/اگست ۱۹۴۱ء کو لاہور میں تاسیسی ارکان کا اجلاس بلایا تو مولانا نعمانی اس میں پورے خلوص و جذبہ کے ساتھ شامل ہوئے اور نائب امیر کے عہدے پر فائز کیے گئے۔ مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ اور مولانا امین احسن اصلاحیؒ کو بھی جماعت کے قریب لانے اور شامل کرانے میں آپ کا خصوصی کردار تھا۔ تاسیسی اجتماع سے واپسی پر آپ نے 'الفرقان' کے شمارہ میں ''ایک دینی تحریک کا تعارف'' کے زیرعنوان ایک مضمون لکھا' جس میں پوری تفصیل سے اس اجتماع اور جماعت (اسلامی) کے قیام کا ذکر کیا اور اس کے مقصد' نصب العین اور دعوت وطریق کار کی وضاحت کی۔

بعد میں ایک صاحب خیر مسلمان چوہدری نیاز علی نے مولانا مودودی کو اپنے قائم کردہ مرکز دارالاسلام' پٹھان کوٹ (ضلع گورداسپور) میں مقیم ہو کر کام کرنے کے لیے دعوت دی۔ اسے قبول کرتے ہوئے مولانا مودودی تقریباً ۱۹۴۲ء کے وسط میں مع اہل وعیال وہاں منتقل ہو گئے۔ دو تین ہفتے کے بعد مولانا نعمانی بھی اپنے صاحبزادے عتیق الرحمٰن (سنبھلی) کے ہمراہ رہائش کی نیت سے وہاں پہنچ گئے۔ اس سے آگے جو ہوا' وہ اپنی ''سرگزشت'' میں مولانا کے ہی الفاظ میں پڑھیے:

> ''میرے قیام کو ابھی ایک ہفتہ گزرا ہوگا کہ میرے سامنے بعض چیزیں ایسی آئیں' جن سے معلوم ہوا کہ احکامِ شریعت کی جس درجے کی پابندی' یا کہنا چاہیے کہ جس درجے کا عملی تقویٰ جماعت کے ہر رکن کے لیے شرطِ لازم قرار دیا گیا تھا' خود مولانا مودودی نے اپنے کو ابھی تک اس کا پابند نہیں بنایا ہے' اور یہ کہ جماعت کی تاسیس سے چند روز پہلے والی تنہائی کی گفتگو سے تقویٰ اور شریعت کی پابندی کے بارے میں مولانا کا جو حال میں نے سمجھا تھا' واقعہ میں ان کا حال وہ نہیں ہے۔''

جماعت اسلامی کی دعوت دینے اور اس کی تاسیس میں مولانا نعمانی ہی آگے آگے تھے

اور اس پر 'یقین محکم' کی کیفیت تھی۔ اب جو پیمانے پر شخصیت پوری نہ اتری' تو یک دم اطمینان قلبی رخصت ہو گیا' اور ایک دو ہفتے بعد ہی آپ نے دارالاسلام سے واپسی کے لیے رخت سفر باندھ لیا۔ اور بالآخر کچھ مدت کے غور وفکر کے بعد مولانا نعمانی نے جماعت کی رکنیت بھی ترک کر دی۔

اب بظاہر اس معاملے کی نوعیت کسی طرح بھی ایسی نظر نہیں آتی کہ جماعت اسلامی سے وابستگی ہی ختم کر دی جائے' حالانکہ جماعت کی دعوت اور اغراض ومقاصد انہیں پہلے کی طرح عزیز تھے۔ شوریٰ کے بااثر حضرات کے ذریعے مولانا مودودی کو یقیناً اپنے طرزِ عمل پر نظر ثانی اور اصلاحِ حال کے لیے آمادہ کیا جا سکتا تھا۔ کچھ نہ کچھ کوتاہی یا سستی تو ہر انسان میں ایک فطری چیز ہے' اور یہ کوئی ایسی بات بھی نہ تھی کہ مولانا مودودی کے لائق امارت ہونے کے بارے میں کلام ہو گیا ہو اور رکنیت جماعت جائز نہ رہی ہو۔ اس مقام پر ایک واقعہ کے حوالے سے یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ ترکِ رکنیت کا فیصلہ اپنے ذہن کی پیداوار نہیں' بلکہ منجانب اللہ تھا۔

علمائے دیوبند مجموعی طور پر مولانا مودودی اور جماعت اسلامی کی دعوت سے متفق نہیں تھے' جبکہ مولانا نعمانی کا پرانا تعلق انہی سے تھا۔ مولانا محمد الیاس' بانی تبلیغی جماعت کے ایک میواتی رفیق میاں جی عبدالرحمٰن کے حوالے سے مولانا نعمانی نے ایک واقعہ ''تحدیثِ نعمت'' میں بیان کیا ہے۔ مولانا محمد الیاس کے انتقال کے فوراً بعد میوات کے ایک تبلیغی اجتماع میں مولانا نعمانی کو جانا ہوا۔ واپسی کے سفر میں میاں جی عبدالرحمٰن نے اصرار کر کے مولانا کو اپنے ہمراہ ایک بیل گاڑی میں بٹھا لیا۔ اور بتایا:

> ''..... کہ کوئی دو' ڈھائی برس پہلے گرمی کی ایک دوپہر کو مولانا محمد الیاس میرے حجرے میں آئے اور میرے عرض کرنے پر کہ بات تو آرام کر کے نماز کے بعد بھی ہو سکتی ہے' آپ نے اسی وقت بات کرنے کا تقاضا پیش کیا۔ اس کے بعد حضرت جی نے تمہارا (یعنی راقم محمد منظور نعمانی) نام لے کر فرمایا کہ ان کو جانتے ہو؟ میں نے کہا کہ مجھے تو یاد نہیں۔ فرمایا کہ وہ جن کا بریلی سے رسالہ نکلتا ہے اور وہ بدعات کا' اہل بدعات کا رد کرتے ہیں۔ میں نے کہا کہ ہاں! ان کو تو جانتا ہوں۔ فرمایا کہ وہ ایک غلط جگہ چلے گئے ہیں' اسی وقت ان کے لیے دعا کرنی ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کو وہاں سے نکال لے۔ پھر حضرت مجھے ساتھ لے کر اپنے حجرے میں تشریف لے گئے' مجھے ساتھ کھڑا کر کے پہلے دو رکعت نماز پڑھی' پھر مجھ سے فرمایا کہ ان کے لیے اللہ سے دعا کرو اور اللہ سے مانگو'

خود بھی دعا فرمائی۔‘‘

بقول مولانا نعمانی‘ میاں جی عبدالرحمٰن کی ایک اہم خصوصیت ’مستجاب الدعوات‘ ہونا تھا۔ بعد میں مولانا نعمانی نے حساب لگایا تو یہ وہی مدت بنتی تھی کہ جب آپ جماعت اسلامی کے مرکز دارالاسلام‘ پٹھانکوٹ میں رفقاء کے ہمراہ مقیم تھے۔ (اب رہا یہ سوال کہ جب مولانا نعمانی کو کچھ باتوں کا مشاہدہ اور علم ہوا جس کی بنا پر آپ نے جماعت اسلامی کی رکنیت ترک کی تو پھر آپ نے ان باتوں کو عام کیوں نہیں کیا‘ تاکہ دوسرے لوگ بھی بچ سکتے۔ میرے نزدیک شاید یہ اعمال حلال وحرام اور گناہ وثواب کے ذیل میں نہیں آتے تھے اور ان کا تعلق احساسِ تقویٰ سے تھا جو کہ انفرادی معاملہ ہے۔ دینی کاموں میں جب ایک دوسرے کے ساتھ اطمینانِ قلب اور مکمل ذہنی یکسوئی کا تعلق نہ رہے تو پھر خلوصِ دل سے ساتھ چلنا مشکل ہو جاتا ہے۔ راقم)

۱۹۵۵ء میں دارالعلوم‘ ندوۃ العلماء‘ لکھنؤ کے شیخ الحدیث مولانا حلیم عطا صاحب بیمار ہو گئے اور ان کا صحیح بخاری اور مسلم کا درس بند ہو گیا‘ تو ذمہ دارانِ دارالعلوم کی طرف سے مولانا منظور نعمانیؒ سے درخواست کی گئی کہ درس حدیث کی یہ ذمہ داری آپ قبول فرمائیں۔ بے حد اصرار پر آپ نے ذمہ داری قبول کر لی اور احسن طریقے سے اسے نبھاتے رہے۔ اب کرنا خدا کا یہ ہوا کہ کچھ مہینوں کے بعد مولانا حلیم عطا صاحب بیماری کے ہاتھوں سفر آخرت اختیار فرما گئے۔ اب مولانا نعمانی نے ہی کئی سال (غالباً ۱۹۶۳ء تک) صحیحین کا درس دیا اور علم وحکمت کے موتی بکھیرتے رہے۔

ہندوستان کے تیزی سے بدلتے ہوئے حالات‘ پے در پے مسلم کش فسادات کا بھیانک تسلسل اور مسلمانوں کے مخدوش سیاسی مستقبل کے پیش نظر ۱۹۶۲ء کے لگ بھگ مولانا محمد منظور نعمانیؒ نے ہفت روزہ رسالہ ’ندائے ملت‘ کا اجراء کیا‘ تاکہ ایک تو مسلمانوں کا احساسِ کمتری دور ہو اور دوسرے ان میں سیاسی شعور بیدار کیا جائے۔ ۱۹۶۴ء میں بنگال‘ بہار اور اڑیسہ میں اس درجہ دردناک اور بھیانک مسلم کش فسادات ہوئے کہ انسانوں کی بستی میں اس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ اس وقت ایک پرانے نیشنلسٹ (قوم پرست) کانگرسی رہنما ڈاکٹر سید محمود کی طرف سے مسلمانوں کی بقا اور فلاح کے لیے ایک مجلس قائم کرنے کا تخیل سامنے آیا تو مولانا محمد منظور نعمانی بھی ان کے معاونین میں شامل ہو گئے۔ یوں مسلمانوں کے ایک نمائندہ اجتماع

بمقام لکھنؤ میں ۹/اگست ۱۹۶۴ء کو ’مسلم مجلس مشاورت‘ وجود میں آئی۔

۱۳۶۳ھ بمطابق ۱۹۴۴ء میں دارالعلوم دیوبند کی مجلس شوریٰ نے متفقہ طور پر آپ کو اپنا رکن منتخب کر لیا۔ اور یہ اعزاز آپ کو مرتے دم تک حاصل رہا۔

آزادیٔ ہند کے وقت سے ہی مختلف حلقوں کی طرف سے مخصوص اغراض کی بنا پر ’مسلم شخصی قوانین‘ کے خلاف آوازیں اٹھتی رہتی تھیں‘ لیکن ۱۹۷۲ء تک انہوں نے شدید اور سنگین نوعیت کی شکل اختیار کر لی۔ انہی ایام میں دیوبند کی مجلس شوریٰ کا اجلاس ہوا تو ارکان خصوصاً مولانا منت اللہ رحمانی نے اس مسئلے کی سنگینی کی طرف توجہ دلائی‘ دارالعلوم کے مہتمم قاری محمد طیب صاحب نے بھی اس میں خصوصی دلچسپی لی۔ یوں ہندوستان کے ممتاز علمائے کرام اور ماہرین قانون کا ایک خصوصی اجتماع مذکورہ مسئلے پر غور وفکر کے لیے بلانا تجویز ہوا۔ چنانچہ بمبئی میں ۲۷‘ ۲۸ دسمبر ۱۹۷۲ء کو یہ اجتماع (کنونشن) قاری صاحب کی ہی زیر صدارت منعقد ہوا۔ اس میں آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ کا قیام عمل میں لایا گیا‘ جس کے صدر حضرت قاری محمد طیب اور جنرل سیکرٹری مولانا منت اللہ رحمانی مقرر ہوئے۔ اس بورڈ کی کرتا دھرتا شخصیات میں مولانا محمد منظور نعمانی اور مولانا ابوالحسن علی ندوی بھی شامل تھے۔ مسلم پرسنل لاء کے خلاف ہر قسم کی فتنہ انگیزی کی روک تھام میں اس بورڈ کا بڑا اہم کردار رہا ہے۔

رابطہ عالم اسلامی کی تاسیس بمقام سعودی عرب ۱۹۶۲ء میں ہوئی تھی۔ مولانا علی میاں اپنے خصوصی مقام اور علم وفضل کی بنا پر اس کے تاسیسی ارکان میں سے تھے۔ ۱۹۶۵ء میں ان کی تجویز پر ہندوستان سے دوسرے نمائندے کے طور پر مولانا محمد منظور نعمانی کو منتخب کر لیا گیا‘ اور سفر سے معذوری تک آپ مستقل رابطہ کے رکن کے طور پر اپنا کردار ادا کرتے رہے۔ مولانا نعمانی نے پہلا حج ۱۳۶۸ھ مطابق ۱۹۴۹ء میں کیا۔ بطور رکن رابطہ اس کے اجلاس میں شرکت کرنے کی وجہ سے آپ کے حج کی سعادت حاصل کرنے کے مواقع بھی بڑھ گئے۔ اس طرح آپ نے تقریباً پندرہ سولہ حج کے سفر کیے۔

۱۹۷۴ء میں ایک اجلاس میں شرکت کے لیے دیوبند جاتے ہوئے مولانا محمد منظور نعمانی کو ایک تکلیف دہ حادثہ پیش آ گیا‘ آپ کا رکشہ الٹ گیا اور نتیجتاً کولہے کی ہڈی کا جوڑ (Hip Joint) کھل گیا۔ چند مہینے علاج کے بعد اس کے اثرات کافی حد تک جاتے رہے

اور معمول کی نقل و حرکت شروع ہوگئی۔ اس کے تقریباً دو سال بعد ۱۹۷۶ء میں رمضان المبارک کے بالکل شروع میں مرض کا دوبارہ شدید ترین حملہ ہوا۔ بائیں ٹانگ اور اس کے پورے بالائی حصے پر ورم آ گیا' سخت بخار شروع ہوگیا اور زمین پر پاؤں تک رکھنا مشکل ہوگیا۔ ساتھ جسم پر کپکپی طاری ہوگئی۔ کچھ دن کے علاج اور ٹیسٹ رپورٹوں کے بعد پتہ چلا کہ بلڈ یوریا کا تیز حملہ ہے۔ اس کا علاج شروع ہونے کے کچھ دن بعد بلڈ یوریا میں تو افاقہ ہوگیا لیکن ٹانگ کی تکلیف اور بخار باقی رہا' جس کے لیے ہسپتال داخلہ کرا دیا گیا۔ دس' بارہ دن کے بعد افاقہ ہونے کی صورت میں آپ گھر منتقل ہو گئے اور وہیں آرام کے ساتھ ورزش کا سلسلہ چلتا رہا۔ پورا مہینہ اسی علاج معالجہ میں صرف ہوگیا۔

یہ گویا مولانا نعمانی کی معذوری کی ابتدا تھی جو وقت کے ساتھ بڑھتی چلی گئی۔ آپ کی زندگی کے تقریباً آخری آٹھ سال ضعف پیری اور عالم معذوری میں ہی گزرے۔ بالکل آخری دنوں مولانا سحر نرسنگ ہوم' لکھنؤ میں داخل تھے کہ فرشتۂ اجل آ پہنچا۔ ۲۷/ذی الحجہ ۱۴۱۷ھ مطابق ۴ مئی ۱۹۹۷ء کو شب ساڑھے آٹھ بجے آپ نے داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔ نماز جنازہ اگلے دن صبح دارالعلوم' ندوۃ العلماء میں مولانا قاری صدیق احمد صاحب باندرہ والے نے پڑھائی اور لکھنؤ میں ہی تدفین ہوئی۔ **موت العالِم موت العالَم!**

دارا و سکندر سے وہ مردِ فقیر اولیٰ
ہو جس کی فقیری میں بوئے اسد اللّٰہی
آئین جواں مرداں حق گوئی و بیباکی
اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی!

مولانا نعمانی کے پسماندگان میں دو بیٹیاں اور چار بیٹے مولانا عتیق الرحمٰن سنبھلی' جناب حفیظ نعمانی' جناب حسان نعمانی اور مولانا سجاد نعمانی (مدیر/ایڈیٹر الفرقان) شامل تھے۔ اہلیہ محترمہ آپ کی زندگی میں ہی وفات پا گئی تھیں۔

آپ کی اہم تصانیف میں' اسلام کیا ہے؟ قرآن آپ سے کیا کہتا ہے؟ معارف الحدیث' تصوف کیا ہے؟ آپ حج کیسے کریں؟ تحدیثِ نعمت' ایرانی انقلاب' امام خمینی اور شیعیت وغیرہ شامل ہیں۔ مولانا نعمانیؒ کی سب سے اہم اور مشہورِ زمانہ تصنیف 'معارف

الحدیث' آٹھ جلدوں میں شائع ہوتی ہے۔ بقول مصنف:

''یہ کتاب اپنے زمانے کے خاص حالات اور ایک عام پڑھے لکھے آدمی کی ضرورت کو سامنے رکھتے ہوئے حدیثِ نبویؐ کے ضخیم دفتر سے ایک انتخاب ہے' جو ترجمے کے ساتھ ایسی سادہ اور مختصر تشریح پر مبنی ہے' جس سے حدیث کا اصل مغز و مدّعا ذہن نشین اور دل نشین ہو اور عملی و روحانی اصلاح و ترقی کا ذریعہ بنے۔ مزید یہ کہ اس کتاب کی تالیف اگرچہ علمی نہیں بلکہ اصلاحی نقطۂ نظر سے کی گئی ہے' مگر یہ بات کہنے میں کوئی مضائقہ نہیں کہ بہت سی علمی گرہیں' جن پر درس حدیث میں اکثر لمبی بحثیں ہوتی ہیں' وہ اس کتاب میں بغیر اس کے کہ ان کو باقاعدہ موضوع بحث بنایا گیا ہو' صاف طور پر حل ہوتی ملتی ہیں۔''

اس دور کی ایک مشہور تحریک 'خاکسار' (بانی علامہ عنایت اللہ مشرقی) کے حوالے سے مولانا محمد منظور نعمانیؒ کا فکر انگیز تجزیہ درج ذیل ہے:

''فتنہ مشرقی (خاکسار تحریک) کا رد: الفرقان کے اسی دور میں جبکہ وہ اپنی ساری توجہ شرک و بدعت کے خلاف مرکوز کیے ہوئے تھا' ایک فتنہ علامہ عنایت اللہ مشرقی کی خاکسار تحریک کی شکل میں بھی رونما ہو چکا تھا۔ اور الفرقان کی اشاعت کے پانچویں چھٹے سال میں جبکہ الفرقان کا یہ دورِ اوّل ختم ہو رہا تھا (اس لیے کہ ہندوستان میں ایک بڑی سیاسی تحریک کے آثار نے کچھ نئے مسائل کو توجہ طلب بنا دیا تھا)' یہ خاکساری فتنہ آناً فاناً بہت نمایاں ہوگیا۔ الحمدللہ کہ الفرقان کو اس کے خلاف برسرِ پیکار ہونے اور اس کے اثرات کو روکنے کی بھی توفیق ملی۔

مشرقی کے مقاصد غالباً سیاسی نوعیت کے تھے' مگر لبادہ انہوں نے مسلمانوں کے مذہبی خیالات کی 'اصلاح' کا اوڑھ لیا تھا' اور اس لبادے میں اسلام کو مغربی مادہ پرستی کے طرز پر ایک بالکل مادہ پرستانہ نظریہ زندگی کے رنگ میں رنگنے کا بیڑا اٹھایا ہوا تھا۔ اس نظریہ کی اشاعت اور مقبولیت کے لیے موصوف نے خاکسار تحریک کے نام سے ایک تنظیم کی بنیاد ڈالی' جس کا نظم اور ڈھانچہ ایک فوجی تنظیم کے انداز پر تھا' اس میں قواعد' پریڈ اور اسلحہ برداری وغیرہ سب کچھ تھا۔ مسلمانوں کے نوجوان اور پرجوش طبقے کے لیے اس انداز کی تنظیم میں قدرتی طور پر ایک خاص کشش تھی۔ اور اسلام کی مادہ پرستانہ تعبیر میں اس الحادزدہ طبقے کے لیے کشش (ترغیب) تھی' جو مسلمان تو کہلانا چاہتا تھا مگر ان اعتقادی اور عملی پابندیوں سے آزاد رہ کر جو کہ اسلام کا جزو لاینفک تھیں۔ نیز ایسی

ہر تحریک کی طرح اس تحریک کو بھی اسلام دشمن قوتوں کی خفیہ ہمدردیاں حاصل ہونا ایک یقینی سی بات تھی۔

نتیجتاً اس کا حلقہ اثر تیزی سے وسیع ہونے لگا اور کتنے ہی مسلمان اصل اسلام کو 'مولوی کا غلط مذہب' (یہ مشرقی کی ایک اصطلاح تھی) قرار دے کر ذہنی ارتداد کی گود میں جانے لگے۔ اس فتنہ انگیز تحریک کے مقابلے میں بھی الفرقان کو ایک بھرپور اور یگانہ طریقے سے میدانِ عمل میں آنے کی توفیق ملی' اور تحریری جہاد کے علاوہ کچھ عملی جدوجہد کی سعادت بھی اس بندۂ عاجز کے حصے میں اس سلسلے میں آئی۔

الفرقان کی چھٹی جلد (۱۳۵۸ھ) میں تین شماروں پر مشتمل ایک خاص نمبر اس تحریک کے بارے میں نکالا گیا' جو پورے کا پورا اس عاجز (مولانا نعمانی) کے ایک مقالے پر مشتمل تھا۔ اس کی تمہید میں ذیل کی سطریں لکھی گئی تھیں:

'خاکسار تحریک اور ہمارا فرض: خاکسار تحریک کا مسئلہ اس وقت مسلمانانِ ہند کے اہم ترین مسائل میں سے ہو گیا ہے' کہ اگر چندے یہی رفتار رہی تو پھر اس کی مذہبی اور سیاسی مضرتوں اور ملت پر مرتب ہونے والے اس کے مہلک اثرات اور بد نتائج کا انسداد و دفاع اگر محال نہیں تو قریب بہ محال ضرور ہو جائے گا۔ لیکن یہ دیکھ کر افسوس ہوتا ہے کہ اس کی اس اہمیت کو سمجھنے والے اور اس کے خطرناک عواقب کا ادراک رکھنے والے ہندوستان بھر میں شاید گنتی کے چند ہیں۔ ہماری یہ بہت بڑی غلطی ہے کہ ہم کسی فتنے کی اہمیت کو اس وقت تک محسوس نہیں کرتے' جب تک وہ سیلابی کیفیت نہ اختیار کر لے' حالانکہ

بسر چشمہ باید گرفتن بہ میل
چو پرشد نہ شاید گزشتن بہ پیل

اس سلسلے میں بڑی اور سب سے پہلی ضرورت ہے ایسے لٹریچر کی تیاری اور اس کی زیادہ سے زیادہ اشاعت کی' جس میں نہایت صحیح و سنجیدہ اور منقح طور پر اس تحریک کی حقیقت' اس کے مقصد و منتہا اور اس کے اثرات و نتائج کو بیان کیا جائے' تاکہ جو مسلمان ابھی اس بارہ میں گمراہ نہیں کیے جا سکے ہیں یا جو صرف سرسری طور پر اس عام نظر سے اس کے مخالف ہیں کہ یہ بھی منجملہ دوسری گمراہ اور غلط و مذہبی و سیاسی جماعتوں کے ایک جماعت ہے' اور اس سے زیادہ کوئی غیر معمولی اہمیت ان کے نزدیک اس کی نہیں ہے' وہ اس کی حقیقت اور خصوصی اہمیت کو سمجھ سکیں اور اس سلسلہ میں ان پر حفاظت امت اور

حمایت دین و ملت کا جو خاص وقتی فریضہ عائد ہوتا ہے' اس کے ادا کرنے کے لیے کمربستہ ہو جائیں۔ نیز اللہ کے جو سادہ دل اور نیک بندے 'اسلامی فوجی تنظیم' کے فریب میں آ کر اور اچھرہ (لاہور کا ایک علاقہ) کے 'ادارۂ عالیہ' (خاکسار تحریک کا مرکزی دفتر) کے بے پناہ مگر محض خالی از حقیقت پروپیگنڈہ سے متاثر ہو کر اس میں شامل ہو گئے ہیں' وہ بھی ٹھنڈے دل اور سنجیدہ دماغ کے ساتھ اس کو دیکھ کر اپنی رائے اور اپنے رویے پر نظر ثانی کر سکیں.....''

اس سلسلے میں میرا جو مقالہ آپ کے ہاتھ میں ہے' اُمید ہے کہ ان شاء اللہ یہ اس مقصد کے لیے مفید ثابت ہوگا' اور عام ناظرین کے علاوہ جو حضرات اس تحریک کے متعلق ضروری لٹریچر کی تیاری میں کوئی حصہ لینا چاہیں گے' ان کو بھی اس سے 'خاکسار تحریک' کی حقیقت سمجھنے میں اچھی طرح سے مدد مل سکے گی۔ اس مقالہ میں میرا مطمحِ نظر صرف اس قدر رہا ہے کہ نفس 'تحریک خاکساران' کا مقصد و منتہا' اس کے حالیہ اثرات اور آئندہ کے متوقع نتائج کو ناظرین علیٰ وجہ البصیرت سمجھ سکیں۔ اسی لیے اس میں' میں نے بانی تحریک علامہ مشرقی کے عقائد و خیالات سے براہِ راست تعرض نہیں کیا ہے' بلکہ تحریک کے رخ' اس کے مقصد و منتہا اور اس کے پس منظر کو سمجھ لینے کے لیے ان کے جن خاص خیالات و نظریات سے واقفیت ضروری ہے' صرف انہی کو میں نے ذکر کیا ہے۔''

(یہ طویل اقتباس اس لیے دیا گیا ہے کہ اگر کسی غلط چیز (دعوت) کا آپ کو رد کرنا ہے تو اس کا طریقہ کار کیا ہونا چاہیے' اور پھر یہ قدم جلدی اٹھانا چاہیے' ورنہ بعد میں گمراہی جبکہ وہ جڑ پکڑ لے' کا روکنا بہت مشکل مرحلہ بن جاتا ہے' لیکن صد افسوس کہ اس حوالے سے ہمارا دینی مزاج نہیں بدلا۔ راقم) (جاری ہے)

❁❁❁

اپنے ذاتی اوقات میں سے کم از کم نصف گھنٹہ نکال کر
''بیان القرآن'' کے ترجمہ و ترجمانی کا ضرور مطالعہ کریں'
آپ یقیناً مستفید ہوں گے۔ (ان شاء اللہ!)

تکمیل وختمِ نبوّت کا منطقی تقاضا

قرآن حکیم سے جب یہ بات ثابت ہوگئی کہ جناب محمدؐ رسول اللہ ﷺ تمام نوعِ انسانی کے لیے رسول بنا کر مبعوث کیے گئے ہیں اور آپ ﷺ کی رسالت تا قیامِ قیامت دائم اور جاری وساری ہے تو اس کا منطقی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ خاتم الانبیاء وآخر الرسل محمد ﷺ جو دینِ حق دے کر مبعوث فرمائے گئے تھے اور جس دین کو تمام نظام ہائے حیات پر غالب کرنا آپ ﷺ کا فرضِ منصبی قرار دیا گیا تھا' اس دین کی دعوت وتبلیغ اور اقامت کا کام جاری رہے۔ چنانچہ اب یہ فریضہ اُمتِ مسلمہ کے سپرد ہوا۔ یعنی ایک طرف اللہ کا پیغام تمام بنی نوعِ انسان تک اس درجہ میں پہنچا دینا کہ لوگوں پر حجت قائم ہو جائے کہ وہ اللہ کے ہاں یہ عذر پیش نہ کر سکیں کہ ہم تک تیرا پیغام نہیں پہنچا۔ اور پھر اسی پر بس نہیں' بلکہ پورے کرۂ ارضی پر دینِ حق کو بالفعل غالب وقائم کرنا بھی اس اُمت کی ذمہ داری ہے اس لیے کہ حضور اکرم ﷺ بنفسِ نفیس اپنے مشن کی ایک حد تک تکمیل فرما کر اس دارِ فانی سے رحلت فرما گئے۔ جزیرہ نمائے عرب کی حد تک انقلاب کی تکمیل ہوگئی' لیکن آپ ﷺ کا مشن تو درحقیقت اس وقت پایۂ تکمیل کو پہنچے گا جب پورے کرۂ ارضی پر اللہ کا پرچم سب سے بلند ہوگا۔

اس پہلو سے جہاں تک نبی اکرم ﷺ کا تعلق ہے تو حضور ﷺ اپنے فرضِ منصبی کے اعتبار سے اس پر مامور تھے کہ آپ ﷺ جزیرہ نمائے عرب کی حد تک انقلاب کی تکمیل بنفسِ نفیس فرما دیں۔ یہ گویا آپ ﷺ کی آفاقی' عالمی اور دائمی بعثت ورسالت کا اوّلین مرحلہ تھا جو پورا ہوا۔ لیکن ابھی بین الاقوامی اور عالمی سطح پر دعوت وتبلیغ کا کام باقی تھا جس کا نبی اکرم ﷺ نے اپنی حیاتِ دنیوی کے دوران بنفسِ نفیس آغاز فرما کر پھر اس مشن کو اُمت کے حوالے فرما دیا کہ اب اس فریضہ کی عالمی سطح پر تکمیل تمہارے ذمہ ہے۔ اب ایک ایک فردِ نوعِ بشر تک دعوت وتبلیغ اور شہادت علی الناس کا فرض تمہیں انجام دینا ہے اور پورے کرۂ ارضی پر اللہ کے دین کا بول بالا کرنا یعنی ''اسلامی انقلاب'' تم نے برپا کرنا ہے۔ (کتاب: منہجِ انقلابِ نبویؐ)

رسولِ اکرم ﷺ کی عظمت، آپؐ کے مقصدِ بعثت، اسوۂ رسول ﷺ کے قرآنی تصور، سیرتِ نبوی ﷺ کے مختلف گوشوں، خاص طور پر آپ ﷺ کی حیاتِ طیبہ کے انقلابی پہلو جیسے علمی وعملی موضوعات پر 9 کتابوں کا مجموعہ

رسولِ اکرم ﷺ اور ہم

از ڈاکٹر اسرار احمد رحمہ اللہ

دیدہ زیب ٹائٹل کے ساتھ

516 صفحات پر مشتمل فکر انگیز تالیف

اشاعت خاص (مجلد):

امپورٹڈ آفسٹ پیپر، قیمت: 450 روپے

اشاعت عام (پیپر بیک):

امپورٹڈ بک پیپر، قیمت: 300 روپے

خود پڑھیں۔ دوسروں کو تحفہ میں دیجیے!

مکتبہ خدام القرآن لاہور

36۔ کے، ماڈل ٹاؤن، لاہور فون: 3-35869501-042

maktaba@tanzeem.org

Dec 2018
Vol.67

Regd. CPL No.115
No.12

Monthly Meesaq Lahore

قرآن حکیم کی عظمت، تعارف اور حقوق و مطالبات
جیسے علمی و عملی موضوعات پر 8 کتابوں کا مجموعہ

قرآن حکیم اور ہم

از ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ

دیدہ زیب ٹائٹل کے ساتھ تقریباً 500 صفحات پر مشتمل فکر انگیز تالیف

خود پڑھیں۔ دوسروں کو تحفہ میں دیجیں!

اشاعت خاص (مجلد):
امپورٹڈ آفسٹ پیپر، قیمت: 450 روپے

اشاعت عام (پیپر بیک):
امپورٹڈ بک پیپر، قیمت: 300 روپے

مکتبہ خدام القرآن لاہور
36۔ کے، ماڈل ٹاؤن، لاہور فون: 3-35869501-042
maktaba@tanzeem.org